اقبال اور مولوی احمد دین

مشفق خواجہ

جب آفتاب اُبھرتا ہے تو ستارے باوجود اپنی تمام تابانیوں اور درخشانیوں کے ماند پڑ جاتے ہیں ۔ آفتاب ستاروں کے وجود کو ختم نہیں کرتا بلکہ اپنے لامتناہی سلسلۂ نور کو روشنی کے دیگر ذرائع پر اس حد تک حاوی کر دیتا ہے کہ بظاہر صرف اسی کا وجود دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے ۔ اقبال کی عظمت نے اپنے پیشتر دوستوں اور رفیقوں کے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کیا ۔ اقبال کے بعض دوست اگرچہ اپنی انفرادیت کے دیرپا نقوش چھوڑ گئے ہیں لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جنھیں آج کوئی نہیں جانتا ، حالاں کہ ان میں سے ہر شخص اپنی ذات سے ایک انجمن تھا ۔

انسان اپنے گرد و پیش کے ماحول اور اپنے قریبی احباب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ اقبال نے بھی اپنے ان دوستوں سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن وقت کے ظالم ہاتھوں نے روشنی کے ان بہت سے منابع کو نظروں سے اوجھل کر دیا جن سے اقبال کے آفتاب عظمت نے کسب ضیا کیا تھا ۔ ''بزم اقبال'' علامہ کے ایسے ہی دوستوں اور رفیقوں کی داستان ہے ، جو گمنام ہیں ، ان کے بارے میں تفصیل سے لکھا جائے گا اور اس بزم کے جو اراکین علمی و ادبی حلقوں میں اچھی طرح روشناس ہیں ، ان کی زندگی کا صرف وہی پہلو پیش کیا جائے گا جو اقبال کی ذات سے وابستگی کا شرف رکھتا ہے ۔

مولوی احمد دین کی داستان حیات اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے ۔ مولوی صاحب اپنے عہد کی بلند پایہ شخصیات میں سے تھے اور ان کی کم از کم ایک کتاب ''سرگزشت الفاظ'' تو اردو کے ادب عالیہ میں شمار ہوتی ہے ۔ اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کی نظر سے یہ کتاب نہ گزری ہو ، لیکن اس کے مصنف کے بارے میں آج کوئی کچھ نہیں جانتا ۔ مولوی صاحب کے مفصل حالات زندگی عام طور پر معلوم نہیں ہیں ، اردو ادب کی تاریخوں میں کہیں ان کا ذکر نہیں ملتا ۔ بعض مضامین اور دو ایک کتابوں میں اقبال کے ''دوست'' کی حیثیت سے ان کا تذکرہ ضرور آیا ہے ، لیکن ان سے مولوی صاحب کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں ۔ محمد الدین فوق نے ''تاریخ اقوام کشمیر'' میں گنتی کی چند سطریں لکھی ہیں ۔ ''نقوش'' کے لاہور

نمبر میں مولوی محمد اسماعیل پانی پتی نے بھی انہیں باتوں کو دھرا دیا ہے۔ مولوی صاحب کے خاندان کے جو افراد بقید حیات ہیں، ان کی معلومات بھی بہت محدود ہیں نیز مولوی صاحب کا کتب خانہ اور ذاتی کاغذات بھی دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہے۔ ایسی صورت میں مولوی صاحب کی داستان حیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ مختلف بکھرے ہوئے اشارات اور بعض عینی شاہدوں کی بیان کردہ روایات کے سہارے مولوی صاحب کی روداد زندگی پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ مربوط و مسلسل داستان نہیں، صرف ایک ادھورا سا خاکہ ہے جسے مکمل کرنے کے لیے مزید تحقیق اور چھان بین کی ضرورت ہے۔

ابتدائی حالات: مولوی احمد دین کشمیری الاصل تھے۔ ان کا تعلق کشمیر کی ''لون'' قوم سے تھا۔ اس قوم کے متعلق محمد دین فوق نے ''تاریخ اقوام کشمیر'' میں تفصیل سے بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''لون'' ہندوؤں کا ایک قدیم جنگ جو طبقہ ہے جو ملکی نظم و نسق میں ایک طویل عرصے تک دخیل رہا ہے۔ اس قوم کے مشرف بہ اسلام ہونے کے بارے میں فوق صاحب لکھتے ہیں:

''لون طبقہ کس زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوا؟ اس کے متعلق قیاساً ہی کہا جا سکتا ہے کہ کچھ لوگ حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کے کشمیر آنے سے پیشتر اور بہت زیادہ ان کے قیام کشمیر کے دوران میں دیگر اقوام کے ساتھ مسلمان ہو گئے ہیں''۔[1]

اس قوم کے بہت سے خاندان کشمیر سے نقل مکانی کرکے پنجاب کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے تھے۔ مولوی احمد دین کا خاندان بھی انہیں میں سے ہے۔ مولوی صاحب کے دادا کشمیر سے پنجاب میں آئے اور لاہور کو انہوں نے اپنا مسکن بنایا۔ مولوی صاحب کے دادا کے متعلق کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ ان کے نام، پیشے اور لاہور آنے کے زمانے کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مولوی صاحب کے والد کا نام اللہ دین تھا۔ انہوں نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی تھی اور لاہور جیل میں تعینات تھے۔

مولوی احمد دین ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گوجرانوالہ میں حاصل کی۔ ان کی تعلیم کا آغاز ایک مسجد کے مکتب میں ہوا۔ اس کے بعد وہ لاہور آ گئے، یہاں سنٹرل ماڈل اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے اور یہیں سے بی۔ اے کی سند لی۔ بعد ازاں اسی

۱۔ ''تاریخ اقوام کشمیر'' جلد اول صفحہ ۲۸۴، دوسرا ایڈیشن، مطبوعہ لاہور، ۱۹۳۴ء۔

کالج میں ایم ۔ اے (انگریزی) میں داخلہ لیا لیکن جلد ہی انھوں نے ایم ۔ اے کرنے کا خیال ترک کر دیا اور قانون کی تعلیم کی طرف توجہ کی اور اس امتحان میں کامیابی حاصل کی ۔

مولوی صاحب ابتدا ہی سے نہایت ذہین تھے ۔ بی ۔ اے کے امتحان میں انھوں نے درجہ اول میں کامیابی حاصل کی جس کے صلے میں انھیں طلائی تمغا ملا ۔ گورنمنٹ کالج میں مولوی صاحب کو اردو کے عظیم انشاء پرداز مولوی محمد حسین آزاد کی شاگردی کی سعادت نصیب ہوئی ۔ آزاد سے مولوی صاحب بے انتہا متاثر ہوئے اور اسی تعلق نے ان میں ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا ۔ آزاد نے مولوی احمد دین کی ادبی شخصیت کو بنانے میں جو حصہ لیا ہے ، اس کا اظہار مولوی صاحب کی تصانیف سے بخوبی ہوتا ہے ۔ خصوصاً انھوں نے آزاد کے اسلوب کو اپنانے کی جو کوشش کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ۔

مولوی احمد دین نے قانون دان کی حیثیت سے ایک ممتاز مقام حاصل کیا دیوانی معاملات میں انھیں کمال حاصل تھا ۔ ان کی قانونی قابلیت کے اقبال بھی معترف تھے اور جیسا کہ آگے چل کر ذکر آئے گا وہ قانونی معاملات میں ان سے مشورہ کرتے رہتے تھے ۔

انجمن حمایت الاسلام : مولوی احمد دین کی صلاحیتیں صرف اپنے پیشہ ورانہ فرائض تک ہی محدود نہ تھیں ۔ وہ سماجی اور ادبی تحریکوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس صدی کے ربع اول میں لاہور کی جن چند شخصیات کو سماجی و ادبی اعتبار سے بلند مقام حاصل تھا ، ان میں مولوی صاحب کا بھی شمار تھا ۔ انجمن حمایت الاسلام سے ان کا گہرا تعلق تھا ۔ وہ ایک عرصے تک انجمن کی اسکولز سب کمیٹی اور تالیف و طبع سب کمیٹی کے سکریٹری رہے ۔ نیز سالہا سال تک اسلامیہ کالج لاہور کے سکریٹری کی خدمت بھی انھی کے ذمہ رہی ۔ جن کارکنوں کی بدولت انجمن کو ایک قومی ادارے کی حیثیت حاصل ہوئی ہے ان میں مولوی صاحب کا نام سر فہرست ہے ۔

مولوی صاحب انجمن کے سالانہ اجلاسوں میں بھی تقریریں کرتے اور مقالے پڑھتے تھے ۔ انجمن کے انیسویں سالانہ اجلاس کی روداد میں ، جو ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی ، مولوی صاحب کا ایک مضمون بہ عنوان ''راز و نیاز'' شامل ہے ۔ اس مضمون پر مرتب روداد نے یہ نوٹ دیا ہے :

دوسرا لیکچر موسوم بہ 'راز و نیاز' انجمن کے ایک معزز کارکن مولوی احمد دین صاحب بی اے پلیڈر کا تھا ۔ گو مولوی صاحب کے ساتھ پبلک نے وہ سلوک نہیں کیا جو مولوی الف دین صاحب کے ساتھ برتا تاہم نہایت افسوس ہے کہ ان کا عمدہ اور

بے مثال لیکچر بھی ادھورا رہا اور پورا نہ ہونے پایا ۔ یہ لیکچر بھی شامل روداد ہے ۔[۱]

۱۹۰۸ء میں انجمن میں اندرونی خلفشار پیدا ہوا اور اس کے اراکین دو مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے تو ۳ مئی ۱۹۰۸ء کو دونوں گروہوں کے پانچ پانچ وکلاء نے مل کر آپس میں تمام اختلافات کو ختم کیا ۔ ان وکلاء میں مولوی احمد دین بھی شامل تھے ۔ اخبار ''وطن'' لاہور کی ۱۵ مئی ۱۹۰۸ء کی اشاعت میں اس مصالحتی اجلاس کی جو رپورٹ شائع ہوئی ہے ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب ''طالب اصلاح'' گروہ کے وکیل تھے ، دوسرا گروہ مخالف اصلاح تھا ۔

انجمن کے ایک ایسے ہی تنازعے کا ذکر مولانا عبدالمجید سالک نے بھی کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''. . . . . انجمن میں اختلافات و تنازعات بہت بڑھ گئے تھے اور مقدمہ بازی تک نوبت پہنچ گئی تھی ۔ ''پیسہ اخبار'' ۳۰ اپریل ۱۹۱۰ء میں ایک اطلاع درج ہے کہ ۲۲ اپریل کی شام کو نواب فتح علی خان قزلباش کے دولت کدے پر آنریبل محمد شفیع ، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ، مولوی احمد دین ، شیخ گلاب دین ، مولوی محبوب عالم ، میاں فضل حسین ، چوہدری نبی بخش ، مولوی فضل الدین ، میاں نظام دین اور مولوی کریم بخش جمع ہوئے . . . . . ۔''[۲]

انجمن کشمیری مسلمانان : انجمن کشمیری مسلمانان سے بھی مولوی صاحب کا گہرا تعلق تھا ۔ وہ اس کے بانیوں میں سے تھے ۔ یہ انجمن آن کشمیری مسلمانوں نے قائم کی تھی جو کشمیر سے نکل کر پنجاب میں مستقل طور پر آباد ہوئے تھے اور اس کا مقصد کشمیری مسلمانوں کی فلاح و بہبود تھا ۔ اقبال بھی اس انجمن کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہتے تھے ۔ محمد عبداللہ قریشی نے ''حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں'' کے عنوان سے سہ ماہی ''اقبال'' لاہور بابت اپریل ۱۹۵۶ء میں اقبال اور انجمن کشمیری مسلمانان کے تعلق پر تفصیل سے لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ جب ڈھاکے کے نواب خواجہ سلیم اللہ امرت سر آئے تو ۲۸ دسمبر ۱۹۰۸ء کو ان سے انجمن کا ایک وفد ملا تھا ۔ مولوی احمد دین بھی اس وفد میں شامل تھے ۔

لاہور کی ادبی محفلیں : مولوی صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز کالج کے زمانے ہی سے ہو چکا تھا لیکن اس ذوق کی جلا حکیم امین الدین کے مکان پر منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں ہوئی ۔ ان محفلوں کو ساٹھ ستر سال پہلے کے لاہور کی ادبی

۱۔ راقم الحروف نے اس مضمون کو انجمن ترقی اردو پاکستان کے ترجمان ماہنامہ ''قومی زبان'' کی اشاعت بابت ستمبر ، ۱۹۶۶ء میں بھی شائع کرا دیا ہے ۔
۲۔ ''ذکر اقبال'' شائع کردہ ''بزم اقبال'' لاہور ، ۱۹۵۵ء ، ۷۹ - ۸۰ ۔

اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز سمجھنا چاہیے - ۱۸۹۵ء میں حکیم احمد شجاع کے والد حکیم شجاع الدین نے ایک ماہانہ مشاعرے کی داغ بیل ڈالی - یہ مشاعرہ حکیم امین الدین کے مکان پر منعقد ہوتا تھا اور اس کی کارروائی ماہانہ گلدستہ ''شور محشر'' میں شائع ہوتی تھی -[۱] ''شور محشر'' کے پہلے شمارے میں جو کارروائی شائع ہوئی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا مشاعرہ ۳۰ نومبر ۱۸۹۵ء کو منعقد ہوا تھا - اس میں لاہور کے تمام ممتاز اہل علم اور شعرا نے شرکت کی تھی - مولوی احمد دین بھی اس میں شریک ہوئے - مشاعروں اور ادبی ہنگاموں کا یہ سلسلہ ۱۹۲۲ء تک قائم رہا -[۲] مولوی احمد دین باقاعدگی سے ان محفلوں میں شریک ہوتے رہے - خود مولوی صاحب نے ایک جگہ ان ادبی محفلوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے :

''انیسویں صدی عیسوی کا آخری عشرہ نصف کے زیادہ گزر چکا تھا - شہر لاہور کے بھاٹی دروازہ کے اندر بازار حکیماں میں ایک مشاعرے کی طرح ڈالی گئی - مجلس مشاعرہ حکیم امین الدین صاحب بیرسٹر مرحوم کے مکان پر جو اسی خاندان حکیماں کے ایک نامور رکن تھے ، جن کے نام پر بازار مشہور ہے ، منعقد ہوا کرتی تھی - میر مجلس اسی خاندان کے بزرگ حکیم شجاع الدین صاحب مرحوم تھے - میرزا ارشد گورگانی دہلوی و میر ناظر حسین ناظم لکھنوی مشاعرے کی روح و رواں تھے - دونوں حضرات خود بھی شعر کہہ کر لاتے تھے اور ان کے شاگردوں اور ثنا خوانوں کی ایک دوسرے کے مقابلے میں طبع آزمائیاں مشاعرے کی رونق کو دوبالا کرتی تھیں - دلی اور لکھنؤ کے اکھاڑے تھے - تماشائیوں کا ایک اچھا خاصا جمگھٹا ہوتا تھا - کالجوں کے نوجوان طالب علم بھی شعر گوئی اور شعر فہمی کے شوق میں چلے آتے تھے اور سخن دانی کی داد لینے اور دینے میں کسی سے پیچھے نہ رہتے تھے -''[۳]

حکیم امین الدین کے مکان کے مشاعروں کے علاوہ اس زمانے میں دوسرا بڑا ادبی مرکز حکیم صاحب کے چچا زاد بھائی حکیم شاہباز دین کا مکان تھا - اس کی کیفیت بھی مولوی احمد دین ہی کی زبانی سنیے :

''. . . . . اس مکان کے سامنے جہاں مشاعرہ ہوتا تھا ایک چھوٹا سا مکان ہے - اس کے مالک حکیم شاہباز دین مرحوم امین الدین صاحب کے چچا زاد بھائی

۱- لاہور کی چیلسی - حکیم احمد شجاع ''نقوش'' لاہور جنوری ۱۹۶۶ء ، صفحہ ۳۱ -
۲- ایضاً ، صفحہ ۱۶ -
۳- ''اقبال'' از احمد دین ، مطبوعہ لاہور ۱۹۲۶ء ، صفحہ ۱ -

اس میں رہتے تھے ۔ آپ نہایت ہی دبلے پتلے آدمی تھے لیکن اللہ میاں نے اس مختصر سے جسم میں ایک ایسا دل رکھ دیا تھا جو اسلامی اخوت اور محبت کے جوش سے ہر وقت لبریز رہتا تھا ۔ خاطرداری اور مہمان نوازی ان کا شیوہ اور خدمت اور ہمدردی ان کی جبلت تھی ۔ ان کے فضائل حسنہ نے ان کے مکان کو ایک کامل گھر بنا دیا تھا ۔ شہر کے با مذاق اصحاب یہاں جمع ہوتے تھے ۔ حکیم صاحب کی چاہ اور چائے اور اہل محفل کی نکتہ سنجیاں قومی تحریکوں میں دل چسپی لینے والوں کو اس مکان پر کشاں کشاں لیے آتی تھیں ۔''[۱]

ان ادبی صحبتوں میں مولوی صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ ان محفلوں میں جو لوگ باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے ''ان میں مولوی احمد دین ، شیخ گلاب دین ، مفتی عبداللہ ٹونکی ، مولانا محمد حسن جالندھری ، مولوی اصغر علی روحی ، سید محمد شاہ وکیل ، سر عبدالقادر ، سر شہاب الدین ، سر محمد اقبال ، خواجہ رحیم بخش ، خواجہ کریم بخش ، خواجہ امیر بخش[۲] ۔ خلیفہ نظام الدین اور ماسٹر مولا بخش کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں ۔ اس محفل احباب میں کبھی کبھی سر محمد شاہ دین ، سر محمد شفیع ، فقیر افتخار الدین اور مرزا سلطان احمد بھی آ پہنچتے تھے ۔''[۳] پیسہ اخبار والے مولوی محبوب عالم بھی ان محفلوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے ۔ انھی محفلوں میں مولوی احمد دین کی ملاقات ایسے لوگوں سے ہوئی جنھوں نے مولوی صاحب کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے لیے راستہ ہموار کیا ۔

صحافت : مولوی صاحب کی ادبی و علمی زندگی کا باقاعدہ آغاز ''پیسہ اخبار'' سے وابستگی کے بعد ہوا ۔ اگرچہ اس اخبار سے تعلق کی تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مولوی صاحب نے اسی اخبار سے وابستہ ہو کر صحافت کی تربیت حاصل کی ۔ اس سلسلے میں پھولچند کا پنجاب کی صحافت سے متعلق مضمون ہماری معلومات کا واحد ذریعہ ہے ۔ وہ لکھتا ہے :

M. Mahbub Alam has generally been called ایڈیٹر گر i.e., editor-making editor. This is a happy appellation, since the *Paisa Akhbar* was a varitable training ground for many of the future editors

۱۔ ''اقبال'' از احمد دین ، مطبوعہ لاہور ، ۱۹۲۶ء ، صفحہ ۲ ۔
۲۔ یہ تینوں خواجہ صاحبان سگے بھائی تھے اور مولوی احمد دین کے قریبی عزیز تھے ۔
۳۔ لاہور کی چیلسی ، حکیم احمد شجاع ''نقوش'' لاہور ، جنوری ۱۹۶۶ء ، صفحہ ۳۱ ۔

of the province. The names of Lala Dina Nath, later the editor of the *Hindustan*, Hakim Ghulam Nabi, later the editor of *Al-Hukma*, Munshi Ahmed Din, later the editor of the *Gham-Khwar-i-Alam*, Mohammad-ud-Din Fauq, later the editor of the *Kashmiri*, Maulvi Shuja-Ullah, later the editor of the *Millat*, stand out prominent among those who had served their apprenticeship in this training school.[1]

مولوی صاحب کی سب سے پہلی کتاب ''ابو المظفر محی الدین اورنگ زیب'' پیسہ اخبار ہی کی طرف سے شائع ہوئی تھی ۔ اس ادارے کی طرف سے ان کی ایک دوسری کتاب ''افواج دنیا'' ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی ۔

خیال ہے کہ مولوی صاحب ''پیسہ اخبار'' سے ۱۹۰۳ء میں یا اس سے پہلے ہی علیحدہ ہو گئے تھے ۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے ، مولوی صاحب کی تصانیف بھی ''پیسہ اخبار'' کی طرف سے شائع ہوئی تھیں ، لیکن ۱۹۰۲ء کی مطبوعہ ایک کتاب ''اسرار حرم'' ایسی بھی ہے جو ایک دوسرے ادارے (رام کشن جنرل بک مرچنٹ) کی طرف سے شائع ہوئی تھی ۔ اس وجہ سے یہ خیال کرنا بے جا نہیں کہ انھوں نے ''پیسہ اخبار'' سے علیحدہ ہونے کے بعد ہی ایک دوسرے ناشر سے رجوع کیا ۔

پھول چند کے مذکورہ اقتباس میں ''غم خوار عالم'' کا ذکر ہے لیکن اس نے اس اخبار کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں دی ۔ مولوی احمد دین نے اپنی ایک کتاب ''جلال الدین محمد اکبر کے دیباچے کے آخر میں اپنے نام کے ساتھ ''سابق ایڈیٹر اخبار غم خوار عالم'' لکھا ہے ۔ یہ کتاب اردو اخبار سے وابستگی کے زمانے میں شائع ہوئی تھی ۔ ''اردو اخبار'' سے مولوی صاحب کا تعلق[2] ۱۹۱۶ء یا اس سے پہلے قائم ہو چکا تھا ، اس لیے ''غم خوار عالم'' کے اجراء کا زمانہ ۱۹۰۳ء اور ۱۹۱۵ء کے درمیانی عرصے کو قرار دیا جا سکتا ہے اس اخبار کا کوئی پرچہ پاکستان کے کسی کتب خانے میں محفوظ نہیں ہے ، اس لیے اس

۱۔ Journal of the Panjab University and Historical Society. Vol. II, Part I, April, 1933, p. 38.

۲۔ اس سلسلے میں ایک اور امر بھی قابل لحاظ ہے ۔ اخبار ''وطن'' کے ۱۹۰۸ء کے متعدد شماروں میں ''مہاتما بدھ'' ، ''ابوالفضل'' ، ''رنجیت سنگھ'' کی سوانح عمریوں کا اشتہار ملتا ہے ۔ اس اشتہار میں مصنف کا نام درج نہیں ۔ قیاس ہے کہ یہ مولوی احمد دین ہی کی تصانیف کا اشتہار ہے ۔ اس اعتبار سے مولوی صاحب کا ''اردو اخبار'' سے ۱۹۰۸ء سے قبل وابستہ ہونا تسلیم کیا جا سکتا ہے ۔ اس بنا پر ''غم خوار عالم'' کے اجراء کا زمانہ ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۸ء کا درمیانی عرصہ قرار دینا چاہیے ۔

کے بارے میں کسی قسم کی معلومات پیش کرنا ممکن نہیں ہے ۔

''اردو اخبار'' سے مولوی صاحب کی وابستگی کی اطلاع ان کی تصانیف ''حیات ٹوڈرمل'' اور ''جلال الدین محمد اکبر'' سے ملتی ہے ۔ ان دونوں کتابوں کے سرورق پر ان کے نام کے ساتھ ''ملازم دفتر اردو اخبار'' لکھا ہے ۔ عبداللہ قریشی صاحب کا بیان ہے کہ منشی محمد الدین فوق اس اخبار کے ایڈیٹر تھے ۔[1] یہ اخبار منشی رام اگروال تاجر کتب لاہور جو کتب خانہ تعلیمی پنجاب کے مہتمم تھے ، شائع کرتے تھے ۔ ''حیات ٹوڈرمل'' کے سرورق پر اس اخبار کا مندرجہ ذیل اشتہار درج ہے ۔ اس سے اخبار کی نوعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے :

''اس کتب خانے سے اردو اخبار ہفتہ وار شائع ہوتا ہے جس میں دلچسپ اور مفید مضامین تازہ بتازہ خبروں کے علاوہ شعر و سخن ، دل خوش کن لطائف و ظرائف اور عقل کے کرشمے یعنی حل طلب معمے (بعض انعامی معمے) بھی درج ہوتے ہیں ۔ قیمت سالانہ مع محصول ڈاک صرف ایک روپیہ آٹھ آنے ہے ۔ نقد قیمت ادا کرنے سے ایک روپے کے انعامی ناول اصلی قیمت پر (صرف انعامی ناولوں مندرجہ حاشیہ اخبار میں سے) مفت ملتے ہیں ۔ اخیر سال کو خریداروں میں کئی قسم کے نقدی انعام بھی تقسیم ہوتے ہیں ۔ یہ اخبار بعض صورتوں میں مفت بھی مل سکتا ہے ۔ مفصل حالات و شرائط کے لیے نمونہ کا پرچہ مفت طلب فرما کر ملاحظہ فرمائیں ۔''

اس اخبار کے ادارے کی طرف سے کتابیں بھی شائع کی جاتی تھیں ۔ مولوی صاحب کی بیشتر تصانیف اس ادارے نے شائع کی ہیں ۔

''غم خوار عالم'' اور ''اردو اخبار'' کے سلسلے میں اردو صحافت سے متعلق کوئی کتاب ہماری رہنمائی نہیں کرتی ۔ ایک آدھ جگہ ان اخباروں کا نام ضرور آیا ہے لیکن وہ بھی پھول چند کے بیان کی صدائے باز گشت ہے ۔ پھول چند کی دی ہوئی اطلاع پر کسی نے کوئی اضافہ نہیں کیا ۔

وفات : حکیم احمد شجاع کے بیان کے مطابق ، مولوی صاحب زندگی کے آخری چند برسوں میں مسلسل بیمار رہے اور پاؤں کے چنبل کی وجہ سے وہ گھر سے باہر نہ نکل سکتے تھے ۔ اسی عالم میں آخرکار انھوں نے ایک کام یاب زندگی گزارنے کے بعد چونسٹھ سال کی عمر میں ۱۱ اکتوبر ، ۱۹۲۹ع مطابق

۱۔ مکتوب بنام راقم الحروف مورخہ ۷ فروری ۱۹۶۶ع ۔

۶ جمادی الاول ، ۱۳۴۸ ہجری کو وفات پائی[1] اور انہیں میانی صاحب کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا ۔

شخصیت : مولوی صاحب کی شخصیت بڑی پر کشش تھی ۔ ان کی وضع داری ضرب المثل تھی ۔ ان کی ذات قدیم تہذیب کا بہترین نمونہ تھی ۔ آج بھی بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے مولوی صاحب کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور جن کے ذہن میں ان کی بہت سی یادیں محفوظ ہیں ۔ راقم الحروف کے نام ایک خط میں حکیم احمد شجاع لکھتے ہیں :

''مولوی احمد دین ، مولوی تاج الدین اور میرے عم زاد بھائی حکیم امین الدین نے ایک دایہ کا دودھ پیا تھا اور اس لیے ان تینوں بزرگوں کی آپس میں بھائیوں بھائیوں کی سی محبت تھی . . . . میں ذاتی طور پر مولوی احمد دین صاحب کی اس محبت اور شفقت کو کبھی بھول نہیں سکتا جو میرے والد مرحوم کی وفات کے بعد میرے ایام طفولیت سے لے کر اس وقت تک ، جب تک وہ زندہ رہے ، میری زندگی کا بہت بڑا سہارا رہی ۔ میری کامیابی پر خواہ وہ کسی امتحان میں ہو یا ملازمت کے سلسلے میں انھوں نے ہمیشہ ایسی مسرت کا اظہار کیا کہ ان کا یہ خلوص میرے لیے باپ کے سایۂ عاطفت کا نعم البدل بن گیا ۔''[2]

مولانا غلام رسول مہر مولوی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں :

میں ۱۹۱۱ء میں بہ سلسلہ تعلیم لاہور آیا تھا ۔ اس زمانے میں مولوی احمد دین مرحوم اقبال کے خاص احباب میں شمار ہوتے تھے ۔ ۱۹۲۴ء میں دوبارہ یہاں آیا تو ان کے اور شیخ گلاب دین کے بارے میں سنا جاتا تھا کہ انہیں مولوی صاحب سے خصوصی تعلق ہے ۔ مولوی احمد دین سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی ۔ البتہ انہیں دور سے کئی مرتبہ دیکھا ہے ۔ بالکل کم گو تھے عام روایت یہ تھی کہ سول مقدمات میں انہیں کمال مہارت حاصل ہے ۔ پوشش ہمیشہ سادہ دیکھی ۔ پاجامہ لٹھے کا ، چھوٹا کوٹ ، سر پر ترکی ٹوپی ۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی . . . . اقبال کی ٹوپی بھی ترکی ہوتی مگر بارڈ ۔ مولوی احمد الدین کی ٹوپی سافٹ اور ذرا سیاہی مائل رنگ کی ہوتی تھی . . . . بہرحال مولوی صاحب بڑے

۱۔ اخبار ''حمایت الاسلام'' لاہور بابت ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۹ء (بحوالہ مکتوب جناب عبداللہ قریشی بنام راقم الحروف مورخہ ۱۴ نومبر ۶۶ء) ۔ اس اخبار نے جو اطلاع شائع کی تھی ، اس میں لکھا ہے کہ مولوی صاحب نے ایک مدت کی علالت کے بعد انتقال کیا ۔

۲۔ مکتوب مورخہ ۷ فروری ، ۱۹۶۶ء ۔

متین ، سنجیدہ ، کم گو بزرگ تھے ۔[1]

اولاد : مولوی صاحب نے دو شادیاں کی تھیں ۔ پہلی بیوی سے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں اور دوسری بیوی سے چار لڑکے اور ایک لڑکی ۔ ان میں سے دو لڑکے خواجہ ریاض احمد اور خواجہ امتیاز احمد بفضلہ حیات ہیں ۔ ریاض احمد صاحب اسلامیہ کالج لاہور سے منسلک ہیں ۔ مولوی احمد دین کے ذاتی حالات کے سلسلے میں بعض معلومات انھی سے حاصل ہوئیں ۔ مولوی صاحب کے بڑے صاحب زادے بشیر احمد تھے ۔ ان کے بارے میں مولانا مہر لکھتے ہیں :

''. . . . مولوی بشیر احمد شیخ مبارک علی کے پاس برسوں کام کرتے رہے ۔ وہ بھی پیکر خلوص تھے ، بے مثال لطیفہ باز ۔ کھانا پکانے میں ایسے مشتاق تھے کہ میں نے زندگی میں ویسا کوئی نہ دیکھا . . . . تقسیم سے کئی برس بیشتر وفات پائی ۔''[2]

مولوی صاحب کو لاہور سے عشق تھا ۔ وہ اس شہر سے اس حد تک محبت کرتے تھے کہ وہ خود اس کا ایک لازمی جزو بن گئے تھے اور شاید اسی وجہ سے لاہور سے وہ بہت کم باہر نکلتے تھے ۔ البتہ کشمیری الاصل ہونے کی وجہ سے ہر سال ستمبر کے مہینے میں جب کہ عدالتوں کی تعطیلات ہوتی تھیں ، وہ کشمیر ضرور جاتے تھے ۔ لاہور میں پہلے پہل ان کا قیام سوترمنڈی میں تھا ، پھر لوہاری منڈی میں رہے اور آخر میں بازار حکیماں میں لال حویلی کے سامنے کے مکان میں رہے اور یہیں آن کا انتقال ہوا ۔ وکالت کے سلسلے میں انھوں نے اپنا دفتر لوہاری منڈی میں پھولوں والی گلی کے سامنے کے مکان میں بنایا تھا ۔

اقبال سے تعلقات : مولوی احمد دین اور اقبال کے تعلقات کی داستان دراصل دو ایسے دوستوں کے باہمی ارتباط کی روداد ہے جو آپس میں محبت بھی کرتے تھے اور ایک دوسرے کا احترام بھی کرتے تھے ۔ ان کی دوستی ہر اعتبار سے مثالی تھی ۔ آغاز تعلقات سے لے کر مولوی صاحب کی وفات تک ان دونوں کے تعلقات گہرے رہے ، ایک آدھ مرتبہ شکر رنجی ضرور پیدا ہوئی لیکن وہ بھی حد سے بڑھی ہوئی محبت کا نتیجہ تھی ۔

اقبال مولوی صاحب سے تقریباً بارہ سال چھوٹے تھے ، ظاہر ہے کہ یہ فرق کوئی معمولی فرق نہیں ہے ، لیکن دونوں کے مشترک علمی مذاق نے اس فرق کو بالکل ختم کر دیا تھا اور ویسے بھی دوستی سن و سال کی نہیں ۔ ہم مذاق و ہم مشربی کی پابند ہوتی ہے ۔ ان دونوں میں جو گہرے تعلقات تھے ان کی اور

۱ ، ۲ ۔ مکتوب بنام راقم الحروف ، مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۶۶ع ۔

بھی کئی وجوہ تھیں ۔ مثلاً دونوں کشمیری الاصل تھے اور اس طرح قدرتی طور دونوں میں ایک دوسرے کے لیے کشش تھی ۔ اسی بنا پر دونوں نے ''انجمن کشمیری مسلمانان'' کے ذریعے اپنی برادری کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا ۔ دونوں ہم پیشہ تھے اور قانون دان کی حیثیت سے اپنی اپنی جگہ ممتاز حیثیت رکھتے تھے ۔ اقبال کو اپنے ذاتی معاملات میں مولوی صاحب کی قانونی قابلیت سے فائدہ اٹھانے کی بار بار ضرورت پیش آئی اور اس تعلق نے بھی دوستی کی بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط تر کیا ۔ دونوں کا ''انجمن حمایت الاسلام'' سے گہرا تعلق تھا اور یہ ادارہ بھی ان کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے کا ایک ذریعہ بنا ۔ الغرض مختلف عناصر نے مل کر اقبال اور احمد الدین کو ایک دوسرے سے قریب کیا اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ قربت خلوت و جلوت کے ہر مرحلے میں بڑھتی چلی گئی ۔

اس مقالے کی ابتدا میں بازار حکیماں کی ادبی محفلوں کا ذکر آ چکا ہے ۔ انھیں محفلوں میں اقبال اور احمد دین ایک دوسرے سے روشناس ہوئے ۔ یہ ۱۸۹۵ع کا واقعہ ہے ۔ اقبال اس وقت اٹھارہ سال کے ایک طالب علم تھے ، مولوی احمد دین کی عمر تیس سال کی تھی اور وہ عملی زندگی میں نہ صرف داخل ہو چکے تھے بلکہ علمی و ادبی حلقوں میں خاصی شہرت بھی حاصل کر چکے تھے ۔ یہ دونوں ان ادبی محفلوں میں نیز ''انجمن حمایت الاسلام'' کے جلسوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے اس وجہ سے تعلقات میں گہرائی پیدا ہوتی چلی گئی ۔ ان تعلقات کی مدت تقریباً ۳۴ برس ہے ۔ اس عرصے میں اقبال نے ترقی اور شہرت کے بڑے بڑے مدارج طے کیے ۔ اگر یہ کہا جائے کہ اقبال کو متعارف کرانے میں مولوی احمد دین کی کوششوں کو بھی دخل رہا ہے ، تو یہ کچھ بے جا نہ ہوگا ۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت پر سب سے پہلے تفصیل سے جس شخص نے لکھا وہ مولوی صاحب ہی تھے ۔

علمی و ادبی معاملات سے قطع نظر دونوں ایک دوسرے کی ذاتی زندگی میں بھی بڑی حد تک دخیل تھے ۔ مولوی صاحب اقبال کی ابتدائی زندگی کے تمام ''خفی و جلی'' پہلوؤں سے پوری طرح واقف تھے ۔ اقبال کے ایک قدیم دوست مرزا جلال الدین بیرسٹر نے ''ملفوظات اقبال'' میں رقص و سرود کی محفلوں سے متاثر ہو کر اقبال کے شعر کہنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے : ''میری ملاقات سے پیش تر مولوی احمد دین صاحب نے کئی ایسے مواقع کا ذکر کیا ہے ''۔[۱] رقص و سرود سے اقبال کی دلچسپی کے سلسلے میں مرزا صاحب لکھتے ہیں : ''. . . میں

۱۔ ''ملفوظات اقبال'' مرتبہ محمود نظامی ، دوسرا ایڈیشن ، مطبوعہ لاہور ، ۱۹۴۹ع ، ۱۰۸ ۔

نے بھی مولوی احمد دین مرحوم سے ان کی داستان سن رکھی تھی ۔''[1] ان بیانات سے مولوی احمد دین اور اقبال کی بے تکلفی نیز تعلقات کی گہرائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

اقبال کی دوسری (والدہ جاوید اقبال کے ساتھ) اور تیسری شادی میں جن چھ احباب نے شرکت کی ان میں مولوی احمد دین بھی شامل تھے ۔[2]

جیسا کہ کہا جا چکا ہے اقبال مولوی احمد دین کی قانونی مہارت کے بھی قائل تھے ۔ وہ مقدمات کے سلسلے میں مولوی صاحب کی مدد لیتے رہتے تھے ۔ اس قسم کے ایک مقدمے کا ذکر عبداللہ قریشی صاحب نے کیا ہے ۔ جون ۱۹۲۱ع میں منشی سراج الدین نے ایک معاملے میں قانونی مشورے کے لیے اقبال کو کشمیر بلایا ۔ اقبال اپنے ساتھ مولوی احمد دین کو بھی لے گئے اور ''تقریباً دو ہفتے تک سری نگر میں رہے ۔''[3] مقدمے کے کام سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اقبال اور مولوی صاحب نے بہت سا وقت سیر و تفریح میں بھی گزارا ۔

بعض لوگ اقبال کا کلام بلااجازت چھاپ لیتے تھے اقبال نے ایسے لوگوں پر مقدمہ چلانے کا کام مولوی صاحب کے سپرد کر رکھا تھا ۔ بلااجازت کلام چھاپنے والوں میں ایک صاحب منشی قمر الدین تھے ۔ ان صاحب کے بارے میں اقبال ، منشی محمد الدین فوق ، کے نام ۹ مارچ ۱۹۱۷ع کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''اس سے پیشتر میں اس شخص (منشی قمرالدین) پر مقدمہ دائر کرنے کو تھا مگر مولوی ظفر علی خاں کے کہنے پر باز رہا ۔ اس نے اس سے پیشتر میری نظموں کو میری اجازت کے بغیر شائع کر دیا تھا ۔ اب یہ سب معاملہ مولوی احمد الدین وکیل کے سپرد کیا ہے کہ اگر کوئی میرا کلام میری اجازت کے بغیر چھاپے تو اس پر دعویٰ کر دیا جائے ۔''[4]

۱۹۲۲ع کے بعد مولوی احمد دین بقول حکیم احمد شجاع[5] مسلسل بیمار رہے ۔ اس عرصے میں اقبال ، مولوی صاحب کی مزاج پرسی کے لیے ان کے مکان پر جو بھاٹی دروازے میں تھا ، آتے رہے ۔ جب مولوی صاحب کا انتقال ہوا تو اقبال پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے جنازے میں شرکت نہ کر سکے ۔ انھوں نے

۱۔ ملفوظات اقبال ، ۱۳۳ ۔
۲۔ ''ذکر اقبال'' از سالک ، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ع ، ۶۸ ، ۶۹ ۔
۳۔ ''اقبال اور کشمیر'' از عبداللہ قریشی ، سہ ماہی ''اقبال'' لاہور اکتوبر ۱۹۵۶ع ، ۲۹ ۔
۴۔ ''نقوش'' لاہور ، مکاتیب نمبر جلد اول ، ۲۹۶ ۔
۵۔ مضمون لاہور کی چیلسی ''نقوش'' لاہور ، جنوری ۱۹۶۶ع ، ۵۱ ۔

مولوی صاحب کے فرزند خواجہ بشیر احمد کے نام جو تعزیتی خط لکھا تھا ، وہ یہ ہے :[1]

11-10-29

عزیزم بشیر ، السلام علیکم !

افسوس ہے کہ میں مولوی صاحب مرحوم کے جنازے میں شریک نہ ہو سکا ۔ مجھے اس سے دو ایک روز پہلے نقرس ہو گیا جس کی وجہ سے پاؤں میں سخت تکلیف تھی ۔ حرکت سے قاصر رہا ۔ دوسرے روز دانت کے درد کا بھی اضافہ ہو گیا ۔ میں نے خواجہ صاحب (خواجہ فیروز دین[2] کے ہم دست آپ کو اپنی معذوری کا پیغام بھیجا تھا ۔ معلوم نہیں کہ وہ پیغام آپ تک پہنچا کہ نہ پہنچا ۔ بہرحال مجھے یہ افسوس تازیست رہے گا کہ مرحوم کے لیے آخری دعا جو کی گئی ۔ میں اس میں شریک ہونے سے محروم رہا ۔ خدا تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے کل آپ کے ہاں حاضر ہونے کا قصد تھا مگر اس سے پہلے انجمن کے جلسے میں دیر ہو گئی ۔ انشاء اللہ اب حاضر ہوں گا ۔ اُمید ہے شام کے قریب آپ سب بھائی گھر پر ہوتے ہوں گے ۔ زیادہ کیا عرض کروں سوائے دعائے صبر جمیل کے ۔ والسلام ! محمد اقبال

اقبال اور مولوی احمد دین کی دوستی کے بارے میں حکیم احمد شجاع لکھتے ہیں :

''اقبال اور مولوی احمد دین کے تعلقات بہت قریبی تھے اور مخلصانہ . . . . مولوی صاحب اقبال سے دلی محبت رکھتے تھے اور ان کے کلام سے ان کو بڑا لگاؤ تھا ۔ اقبال بھی اگرچہ مولوی صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے نہ تھے ، لیکن ان کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے اور جو شعر ان کی پسند کی کسوٹی پر پورا نہ اترے ، اسے یا تو نظر انداز کر دیتے تھے اور یا اس پر دوبارہ غور کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ اقبال ہمیشہ اپنے ذاتی معاملات میں مولوی احمد دین سے مشورہ کرتے تھے اور انھیں کے مشورے پر عمل کرتے تھے ۔ کئی معاملات میں یہ مشورے اقبال کے بڑے کام آئے ۔ جب مولوی احمد دین بہت زیادہ علیل ہو گئے اور پاؤں کے چنبل کی وجہ سے چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے تو اقبال بلا ناغہ ان

۱۔ یہ خط ہفت روزہ ''ہماری زبان'' علی گڑھ بابت ۸ مئی ۱۹۶۳ء میں شائع ہو چکا ہے ۔ مجھے اس کی نقل جناب عبداللہ قریشی صاحب کے ذریعے دستیاب ہوئی ہے ۔ ''ہماری زبان'' کے مطبوعہ متن میں بعض الفاظ غلط نقل ہوئے ہیں ۔ یہاں قریشی صاحب کا ارسال کردہ متن درج کیا جا رہا ہے ۔

۲۔ خواجہ فیروز الدین اقبال کے ہم زلف ، گہرے دوست اور لاہور کے مشہور بیرسٹر تھے ۔

کی مزاج پرسی کے لیے میکلور روڈ کی کوٹھی سے بازار حکیماں میں آیا کرتے تھے ۔[۱]
مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں : . . . . مولوی احمد الدین مرحوم اقبال کے بڑے ہی مخلص دوست تھے ایسے دوست جیسے آج کل دیکھنے میں نہیں آتے ۔[۲]

اس محبت اور خلوص کے باوصف ایک مرتبہ ان دونوں دوستوں میں شکر رنجی بھی پیدا ہوئی ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۲۴ء میں ''اقبال'' کے نام سے مولوی احمد دین نے ایک کتاب لکھی جس میں اقبال کی شاعرانہ حیثیت سے بحث کی گئی تھی ۔ عام روایت یہ ہے کہ اقبال کو اس کتاب کی اشاعت پسند نہ آئی کیونکہ اس وقت تک ان کا پہلا اُردو مجموعہ کلام ''بانگ ِدرا'' شائع نہ ہوا تھا ۔ ان کا یہ خیال تھا چونکہ اس کتاب میں بہت سا کلام بھی شامل کیا گیا ہے اس لیے یہ مجموعہ ٔ کلام کی اشاعت و فروخت پر اثر انداز ہو سکتی ہے ۔ مولوی احمد دین کو جب اقبال کی ناپسندیدگی کا علم ہوا تو انہوں نے یہ کتاب جلا دی ۔ ۱۹۲۶ء میں یہ کتاب دوبارہ شائع ہوئی ۔ اس سلسلے میں مختلف واقف حال حضرات کے بیانات کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا ۔ مولانا غلام رسول لکھتے ہیں :

''اقبال کے متعلق کتاب مولوی صاحب نے مرتب فرمائی تھی ۔ اس میں ایسی نظمیں بھی شامل تھیں جنھیں اقبال اپنے کلام سے خارج کر چکے تھے ۔ ایک کاپی دیکھ کر غالباً اقبال نے اسی خیال سے ہلکے انداز میں نا پسندیدگی کا اظہار کیا ، بلا واسطہ نہیں بالواسطہ ۔ مولوی صاحب نہایت مخلص دوست تھے ، ان کے خلوص کا تقاضا یہ ہوا کہ سرسری بیان سنتے ہی مزید استفسار یا رو در رو گفتگو کا بھی انتظار نہ کیا اور پوری کتاب جلوا دی ۔ صرف چند کا بیان اس وقت تک تقسیم ہوئی تھیں ۔ پھر ''بانگ درا'' چھپ گئی تو از سر ِ نو کتاب چھاپی جس میں سے وہ کلام بیشتر خارج کر دیا تھا جسے اقبال خود خارج کر چکے تھے ۔ میں نے ایک مرتبہ اصل کاپی بھی دیکھی تھی ۔ میرا احساس یہی تھا کہ انھوں نے محض جذبہ ٔ خلوص میں یہ قربانی کر دی ورنہ اس میں خارج کردہ کلام کی زیادہ مقدار شامل نہ تھی ۔ اس سے زیادہ کلام انجمن (حمایت اسلام) کی سالانہ کارروائیوں میں نیز اخباروں اور رسالوں خصوصاً مخزن میں چھپ چکا تھا ۔''[۳]
حکیم احمد شجاع صاحب کی رائے میں اصل واقعہ یوں ہے :

''مولوی احمد دین نے سب سے پہلے اقبال کو ان کے اصلی روپ میں دیکھا

۱۔ مکتوب بنام راقم الحروف ، مورخہ ۷ فروری ۱۹۶۶ء ۔
۲۔ مکتوب بنام راقم الحروف ، مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۶۶ء ۔
۳۔ مکتوب بنام راقم الحروف ، مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۶۶ء ۔

اور اُن کی شاعری کو اس کے رنگ میں سمجھا اور ''اقبال'' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی اور اس میں اقبال کے وہ تمام اشعار جمع کیے جو بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح ابھی کسی لڑی میں نہ پروئے گئے تھے اور پھر ان اشعار کی اس طرز پر تشریح کی جس پر ''مائنڈ اینڈ آرٹ آف شیکسپیئر'' لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب لاہور کے ایک نامور ناشر شیخ مبارک علی نے چھاپی لیکن ابھی یہ کتاب شائع نہ ہوئی تھی کہ اقبال کو اپنے کلام کے مجموعے کو شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا اور یہی وہ مجموعہ ہے جس نے بعد میں ''بانگ درا'' کی شکل اختیار کی۔ مولوی احمد دین نے اس خیال سے کہ ان کی کتاب کی اشاعت سے ''بانگِ درا'' کی اشاعت کو نقصان پہنچے گا، اپنی کتاب خود ہی تلف کر دی اور اس طرح دنیائے ادب ایک بڑی مفید تحقیقی یادداشت سے محروم ہو گئی۔''[۱]

شیخ مبارک علی صاحب لاہور کی گزشتہ نصف صدی کی علمی و تہذیبی زندگی کے ایک ایک پہلو سے پوری طرح واقف ہیں۔ اقبال اور دیگر اکابر سے ان کے بہت گہرے مراسم تھے۔ مذکورہ بیان کے سلسلے میں میں نے ان کی رائے طلب کی تو انھوں نے یہ جواب ارسال فرمایا:

''مولوی احمد دین اور ڈاکٹر اقبال صاحب کے تعلقات ہمیشہ برادرانہ رہے شیخ صاحب (اقبال) کسی اور دوست کے گھر کبھی نہ گئے۔ صرف مولوی احمد دین کی شخصیت ایسی تھی جہاں ڈاکٹر صاحب کی کسی قدر بے تکلفی تھی، وہ ان کے ہاں وقتاً فوقتاً جایا کرتے تھے۔ چنانچہ انھی تعلقات کی بنا پر اور کچھ عقیدت کے تحت مولوی صاحب مرحوم نے ''اقبال'' لکھی جس میں ڈاکٹر صاحب کے حالات زندگی کے علاوہ ڈاکٹر مرحوم کی طویل نظمیں مثلاً ''شکوہ جواب شکوہ'' ''فریاد امت'' ''طلوع اسلام'' وغیرہ بھی آ گئی تھیں جب وہ کتاب ڈاکٹر صاحب قبلہ کے سامنے پیش کی گئی تو انھوں نے دیکھ کر یہ کہا کہ اس کتاب کے ہوتے ہوئے میرے دوسرے کلام کے مجموعے کی کیا ضرورت ہے؟ بظاہر وہ ناراض نہ تھے۔ اس پر مولوی صاحب مرحوم نے اس کتاب کی کل کاپیاں نذر آتش کر دیں کیونکہ ان کو ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں کافی دخل تھا، وہ نہیں چاہتے تھے کہ اقبال کا دل کسی طرح بھی میلا ہو۔ جب ڈاکٹر صاحب کو اس واقع کا علم ہوا تو ان کو اس کا کافی صدمہ ہوا۔ اس کے کچھ عرصے بعد مولوی احمد دین نے اپنی کتاب ''سرگزشت الفاظ'' لکھی جس پر ڈاکٹر اقبال نے سفارش کرکے مبلغ پانچ صد روپے انعام دلوایا . . . . یہ کتاب ''اقبال'' مولوی صاحب نے ہی . . . . چھپوائی . . . . اس کی طباعت وغیرہ کسی چیز میں ہمارے ادارے کا کوئی دخل نہ تھا۔ صرف ہمارے پاس اس کا کچھ وقت کے لیے اسٹاک رہا اس

۱۔ لاہور کی چیلسی مطبوعہ ''نقوش'' لاہور، جنوری ۱۹۶۶ء، ۲۸۔

لیے (بطور تقسیم کنندہ) ہمارا نام اس کتاب پر تھا ۔''[۱]

عبداللہ قریشی صاحب نے بھی اس سلسلے میں تفصیل سے لکھا ہے ۔ ان کا بیان اگرچہ قدرے طویل ہے لیکن معاملے کے سب پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے اسے نقل کرنا ضروری ہے ، وہ لکھتے ہیں :

''کہتے ہیں کہ اس کتاب میں مولوی صاحب نے اقبال کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے ان کی تمام ابتدائی نظمیں اور غزلیں جو انہوں نے از رہ خلوص و محبت جمع کر رکھی تھیں ، شائع کر دی تھیں ۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح یہ منتشر کلام جمع ہو کر دستبرد حوادث سے محفوظ ہو جائے گا اور اقبال خوش ہوں گے کیونکہ اس وقت تک ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا اور ان کی شاعری پر بھی کوئی مستند کتاب اردو زبان میں نہیں لکھی گئی تھی مگر مولوی صاحب کا خیال غلط نکلا ۔ انہیں مایوسی ہوئی کیوں کہ جب کتاب چھپ کر اقبال کے پاس پہنچی اور شیخ گلاب دین نے اس کے متعلق اقبال کی رائے دریافت کی تو اقبال نے مذاق ہی مذاق میں کہہ دیا کہ میں تو نظر ثانی کے بعد اپنے کلام کا مجموعہ ابھی مرتب ہی کر رہا تھا کہ مولوی صاحب نے ''اقبال'' کو بیچنا بھی شروع کر دیا ، کم از کم وہ میری کتاب کا انتظار کر لیتے ۔

مولوی صاحب نے جب یہ بات سنی تو اس کا کچھ اور ہی مطلب لیا ۔ اقبال کا کلام چھاپ کر اقبال کو نقصان پہنچانا اور جو اشعار ان کے معیار سے گر چکے تھے انہیں محفوظ کر کے اقبال کی شہرت کو بٹا لگانا مولوی صاحب کا مقصد نہ تھا انہوں نے کتاب کی تمام جلدیں اپنے مکان کے صحن میں ڈھیر کر کے ان کو آگ لگا دی ۔ خود کرسی بچھا کر ایک طرف بیٹھ گئے اور جب تک کتاب کا ایک ایک ورق جل کر راکھ نہ ہو گیا وہاں سے نہ ہلے اور گھر پھونک تماشا دیکھتے رہے ۔

اقبال کو اس واقعے کا علم ہوا تو انہوں نے بڑا افسوس ظاہر کیا ۔ مولوی صاحب سے معذرت طلب کر کے ان کو دوبارہ کتاب چھاپنے پر راضی کیا ۔ چنانچہ ''بانگ درا'' کی اشاعت کے دو سال بعد ۱۹۲۶ء میں یہ کتاب از سر نو لکھ کر دوبارہ شائع کی گئی اور اس دفعہ کلام کا بہت سا حصہ حذف کر دیا گیا ، صرف منتخب اشعار پر اکتفا کیا گیا ۔''[۲]

مذکورہ بالا بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال نے کتاب کی اشاعت کو محض اس وجہ سے ناپسند فرمایا تھا کہ اس زمانے میں ''بانگ درا'' کی طباعت کی تیاریاں ہو رہی تھیں ۔ ''اقبال'' میں علامہ کی تقریباً تمام اہم نظمیں شامل تھیں ۔

۱۔ مکتوب بنام راقم الحروف ، مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۶۶ء ۔
۲۔ ''حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں ''سہ ماہی'' اقبال'' لاہور ، اکتوبر ۱۹۵۴ء ، ۴۴—۴۶ ۔

ظاہر ہے ایسی صورت میں ''بانگ درا'' کی اشاعت متاثر ہوتی ۔ مولوی احمد دین کی کتاب اقبال سے عقیدت و محبت کا نتیجہ تھی جو انھوں نے کسی تاجرانہ خیال سے شائع نہیں کی تھی ۔ اقبال کی شکایت بھی بے جا نہ تھی ، لیکن مولوی احمد دین کا غصے میں آ کر پوری کتاب کو جلا دینا جہاں ایک طرف ان کی انتہا پسندی کی دلیل ہے وہیں دوسری طرف اس سے اُس محبت و خلوص کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو انھیں اقبال کی ذات سے تھا ۔ مندرجہ بالا بیانات میں جزئیات کی حد تک کہیں کہیں اختلاف ہے ، البتہ عبداللہ قریشی صاحب نے بالکل ایک نئی بات لکھی ہے کہ اقبال نے مولوی احمد دین کو ''اقبال فروشی'' کا الزام دیا ۔[1] اقبال کی ذات سے یہ بدگمانی کسی طرح مناسب نہیں ، ایک دیرینہ دوست اور قدردان کے لیے اقبال کبھی ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے ۔

اس معاملے کا ایک پہلو تحقیق طلب ہے اور وہ یہ کہ جب مولوی احمد دین اور اقبال میں اتنے گہرے مراسم تھے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اقبال کو کتاب کی طباعت کا پہلے سے علم نہ ہو ؟ مولوی احمد دین کو تو اقبال نے اُن لوگوں کے خلاف قانونی کاروائی کرنے پر متعین کر رکھا تھا جو بلا اجازت ان کا کلام شائع کرتے تھے ۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ مولوی صاحب خود اُس جرم کا ارتکاب کرتے جس کے سدباب کے لیے انھیں متعین کیا گیا تھا ؟ مولوی صاحب کے فرزند خواجہ ریاض احمد کے بیان سے اس معاملے پر نئی روشنی پڑتی ہے ۔ راقم الحروف کے نام انھوں نے اپنے مکتوب مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۶۶ء میں لکھا ہے :

''شیخ گلاب دین صاحب مرحوم جو والد صاحب کے دوست بھی تھے اور اقبال کے بھی ، انھوں نے والد صاحب کو بتایا کہ یہ کتاب ''اقبال'' کہیں ''بانگ درا'' پر (جو شائع ہونے والی تھی) اثر انداز نہ ہو ۔ والد صاحب نے یہ سنا تو انھوں نے شیخ گلاب دین صاحب سے کہا کہ ان کا مقصد کتاب لکھنے کا یہ ہرگز نہیں کہ اقبال کو کسی قسم کا نقصان ہو ، اس لیے انھوں نے اس کتاب کو صحن میں رکھ کر بالکل جلا دیا ۔''

ریاض صاحب کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے کتاب کی اشاعت پر ناراضگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ شیخ گلاب دین مرحوم کے سمجھانے پر مولوی صاحب نے کتاب کو جلایا ۔ یہ بیان چونکہ مولوی صاحب کو بے حد قریب سے جاننے والے ایک شخص کا ہے ، اس لیے اسے قبول کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے ۔ اس بیان کی روشنی میں اقبال کتاب کو جلائے جانے کا سبب قرار نہیں دیے

۱۔ یہ بات نہیں ۔ عبداللہ قریشی نے صرف اس کتاب کے بیچنے کا ذکر کیا ہے جو ''اقبال'' کے نام سے شائع ہوئی تھی ۔

جا سکتے ۔ اقبال کو یقیناً اس کتاب کے ضائع ہونے پر افسوس ہوا ہوگا ، جبھی تو انھوں نے اصرار کرکے اس کتاب کو دوبارہ چھپوایا ۔ اگر یہ کتاب اقبال کی ناپسندیدگی کی وجہ سے مولوی صاحب نے جلائی ہوتی تو وہ دوبارہ کبھی اسے شائع نہ کرتے ۔

اس تاریخی کتاب کے ضائع شدہ ایڈیشن کا صرف ایک نسخہ باقی ہے جو خواجہ ریاض احمد کے پاس ہے ۔ کاش یہ تاریخی یادگار قومی عجائب گھر یا ''اقبال اکیڈمی'' میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے ۔

علمی و ادبی خدمات : مولوی احمد دین کی ساری زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزری ۔ انھوں نے اردو زبان کو بہت کچھ دیا ۔ اس زبان پر ان کے بے شمار احسانات ہیں ۔ محمد حسین آزاد کے بعد جس صاحب قلم نے لسانیات اور خصوصاً تحقیق الفاظ پر مفصل بحث کی ، وہ مولوی صاحب ہی تھے ۔ ان کی کتاب ''سرگزشت الفاظ'' اس موضوع پر پہلی کامیاب کوشش ہے ۔ اردو تنقید میں سائنٹیفک انداز سب سے پہلے انھوں نے ہی اختیار کیا ۔ ''اقبال'' جہاں ایک طرف علامہ کے فن کا پہلا کامیاب تجزیہ ہے ، وہیں دوسری طرف اردو ادب میں بھی عملی تنقید کا پہلا کامیاب نمونہ ہے ۔ سیرت و سوانح میں بھی مولوی صاحب نے قابل قدر کارنامے چھوڑے ہیں ۔ خصوصاً اورنگ زیب عالم گیر پر ان کی کتاب اس اعتبار سے اولیت رکھتی ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ اورنگ زیب کا مدلل دفاع پیش کیا گیا ہے ۔ مولوی صاحب کی ان علمی و ادبی خدمات پر علیحدہ علیحدہ بحث کرنے کی بجائے ان کی تمام تصانیف کا جائزہ آئندہ سطور میں پیش کیا جائے گا اور اس سے معلوم ہوگا کہ ماہر لسانیات ، نقاد اور سوانح نگار کی حیثیت سے آن کا کیا درجہ ہے ۔

مضمون نگاری : مضمون نگار کی حیثیت سے مولوی صاحب ایک بلند مقام کے مستحق ہیں ۔ ان کا کام ہماری نظر سے اوجھل رہا ، یہ ان کا نہیں ہمارا قصور ہے ۔

''پیسہ اخبار'' ''غم خوار عالم'' اور ''اردو اخبار'' کے علاوہ مولوی صاحب نے اس زمانے کے دوسرے اخباروں میں بھی ضرور لکھا ہوگا ۔ اپریل ۱۹۰۱ع میں جب شیخ عبد القادر نے ''مخزن'' جاری کیا تو اس کے پہلے ہی شمارے میں مولوی احمد دین کا ایک مضمون ''مطالعۂ الفاظ'' شامل کیا ۔ مضمون کے ساتھ شیخ صاحب نے یہ نوٹ لکھا :

''ذیل میں ہم ایک تمہیدی مضمون ''مطالعۂ الفاظ'' پر درج کرتے ہیں ۔ اس کے لکھنے والے ہمارے مکرم دوست مولوی احمد دین صاحب بی ۔ اے وکیل ، مصنف ''اورنگ زیب'' ہیں ۔ مولوی احمد دین صاحب اپنے زمانۂ تعلیم میں نامور طلبہ رہے ہیں اور فراغت تحصیل کے بعد لاہور کے نامی وکلاء میں ہیں ۔ اس سلسلۂ مضامین کی تکمیل پر یقیناً سب ناظرین کی رائے ہوگی کہ یہ اردو میں ایک

مفید اور نئی چیز ہے ۔''[1]

اس اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۹۰۱ع تک مولوی صاحب کو مصنف کی حیثیت سے اچھی خاصی شہرت حاصل ہو چکی تھی ۔ اس مضمون کی دوسری قسط ستمبر ۱۹۰۱ع کے مخزن میں شائع ہوئی تھی ۔ یہ مضمون دراصل مولوی صاحب کی بلند پایہ تصنیف ''سرگزشت الفاظ'' کا ابتدائی نقش ہے ۔ ''مخزن'' میں مولوی صاحب کے دو اور مضامین بھی ملتے ہیں : (۱) ''لاہور کا محرم'' شمارہ ماہ اگست ۱۹۰۱ع[2] (۲) ''مجاز و حقیقت'' شمارہ بابت ماہ اپریل ۱۹۰۲ع[3] اول الذکر مضمون میں لاہور کے محرم کی تصویر کشی کی گئی ہے اور دوسرے مضمون میں نہایت شاعرانہ انداز میں مجاز و حقیقت کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے :

''حسن بتاں موسیقی کے دل کش نغموں کی طرح ظاہر کے تاروں سے باطن کے پردے ہلاتا ہے ۔ اس کی اداؤں میں بھی وہی جادو کے انداز ہیں ۔ اگر کوئی گا رہا ہو تو کان لگاؤ ۔ دیکھو تو کس جادو کے انداز سے مست ترانوں کی ہوش ربا سریلی آواز ہمارے دل کی ناسپردہ پیچ در پیچ راہوں میں سے ہوتی ہوئی اپنی اٹکھیلیوں سے اس کے نازک سے نازک پردوں کو چھیڑتی جاتی ہے اور اپنی اس سحر اثر چال سے ہماری موجودہ اور گزشتہ زندگی کے تاروں میں ایک خاموش حرکتِ یگانگت پیدا کر رہی ہے ۔ اس کے تھوڑے سے چھیڑنے سے آن کی آن میں ہماری عمر بھر کی سوز و الفت کی چنگاریاں جو محنت و کلفت کے سالوں میں بکھری پڑی تھیں ہمارا دل گداز کیے دیتی تھیں ۔''

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے مولوی صاحب کا کئی اخبارات سے تعلق رہا ۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے ان اخباروں میں بہت سے مضامین لکھے ہوں گے ۔ مگر ان مضامین کی نشاندھی ممکن نہیں ۔ جو چار مضامین دریافت کیے جا سکے ہیں ان میں ''راز و نیاز'' ایک بلند پایہ ادبی تخلیق ہے ۔ اسے اردو کے بہترین انشائیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔ یہ مضمون مولوی صاحب نے جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے ، انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھنے کے لیے لکھا تھا لیکن بوجوہ اسے مکمل طور پر اجلاس میں پڑھا نہ جا سکا اور بعد میں ۱۹۰۴ع کی سالانہ

۱۔ ''مخزن'' لاہور ، جلد ۱ ، شمارہ ۱ ، بابت اپریل ۱۹۰۱ع ، ۸
۲۔ یہ مضمون راقم الحروف نے روزنامہ ''جنگ'' کراچی کے محرم نمبر ۳ مئی ۱۹۶۶ع میں بھی شائع کرا دیا تھا ۔
۳۔ دوسری بار یہ مضمون ''قومی زبان'' بابت ستمبر ۱۹۶۶ع میں شائع ہوا ۔

روداد میں شائع ہوا[1] اس انشا میں مصنف نے تمثیلی انداز میں ایک بہت بڑے قومی مسئلے کو پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مسلمان جب تک ایسے لوگوں کے اثر سے آزاد نہ ہوں گے جو مذہب کی آڑ میں ذاتی فوائد حاصل کرتے ہیں ، اس وقت تک قومی ترقی کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ انجمن ''حمایت الاسلام'' کو عاشق قرار دیا ہے ، قوم کو معشوق اور خود غرض مذہب فروشوں کو رقیب بنا کر پیش کیا ہے ۔ عاشق ، معشوق سے شکوے گلے کرتا ہے اور رقیب کی بد اعمالیوں کی داستان بیان کرتا ہے ۔ مضمون کا تمثیلی انداز قاری کو اصل معاملے کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے ۔ یہ فن مولوی احمد دین نے اپنے استاد محمد حسین آزاد سے سیکھا ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شاگرد اگر استاد سے آگے نہیں بڑھا تو اس سے پیچھے بھی نہیں رہا ۔ اس انشائیے میں اس زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کی حالت کی کامیاب عکاسی کی گئی ہے ۔ سرسید ، ان کی تحریک اور ان کے مخالفوں کی سرگرمیوں کو چند سطروں میں اس طرح بیان کیا ہے کہ تمام حالات کا ایک ایک پہلو نظروں کے سامنے آ جاتا ہے ، لکھتے ہیں :

'' آپ کی ان رسوائیوں اور ذلتوں کے درمیان آپ کے باغ کے مالی کی ، وہی مالی جس نے تیرہ سو سال ہوئے کہ قسم قسم کے پھل ہوئے ، دور دور سے اکٹھے کرکے خوبصورت چمنوں میں سجا دیے تھے ، یادگار ایک بڈھے جوان مرد نے آپ کی اس حالت کو دیکھا ۔ اپنے نانا کے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودوں کو سوکھ کر کانٹا ہوتے دیکھ کر ایک آگ سی دل میں لگ گئی اور اس نے کوشش کی کہ وہی آگ کچھ اور دلوں میں بھی ،جہاں کہیں ہوں ، لگا کر ایک تماشا دیکھے اور دکھائے کہ آگ سے گل راز کیسے کھلتا ہے :

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں

بڈھے کی اس آگ سے ایک بھبھوکا اٹھا اور اٹھتے ہی چاروں طرف سے اس پر پانی ڈالنے کی کوشش کی گئی لیکن ان دنوں میں ہوا بھی کچھ ایسی چل رہی تھی کہ اس آگ کی چنگاریاں ادھر ادھر پھیل گئیں اور اس سے باغ میں عجب ہل چل سی مچ گئی ۔ ایک طرف تو وہ چنگاریاں ایسی خشک ٹہنیوں اور پتوں میں جا پڑیں کہ یک لخت آگ بھڑک اٹھی اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جوکچھ سامنے آیا بڈھے کی خواہشوں کے برخلاف جلا کر راکھ کر ڈالا ۔ دوسری طرف آگ بجھانے والوں نے بے سوچھے سمجھے اس قدر پانی ڈالا کہ آگ تو بجھ گئی مگر

۱۔ دوسری مرتبہ یہ مضمون ''قومی زبان'' کراچی بابت ماہ اپریل ۱۹۶۶ع میں شائع ہوا ۔

پانی پودوں اور بڑے بڑے درختوں کو بھی بہا کر لے گیا ۔ درخت اگرچہ باغ کی چار دیواری کے اندر ہی رہے مگر دیکھا تو بے سرو سامانی کی حالت میں پڑے ہاتھ پاؤں پھیلائے ہوئے چھوٹے پودوں اور گھاس کو پھولنے اور پھلنے اور سر اٹھانے سے روک رہے ہیں . . . ۔

باغ کی دیوار پر ایک بلبل جو اسی باغ کی ہوا خواہ تھی اور یہیں کی تربیت یافتہ ، باغ کے اس ویرانے پر آنسو بہا رہی تھی اور اپنے نالوں سے دلوں کو ہلا رہی تھی زار زار روتی تھی اور کہتی تھی :

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر
تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و وا ویلا

مولوی احمد دین کا صرف یہی ایک مضمون انھیں اردو زبان کا ایک صاحب طرز انشاء پرداز منوانے کے لیے کافی ہے ۔

تصانیف : مولوی صاحب کی تصانیف و تراجم کے بارے میں قطعی طور پر کچھ بتانا ممکن نہیں ہے ۔ منشی محمد الدین فوق نے ان کی صرف تین کتابوں ''عالم گیر'' ، ''اقبال'' اور ''سرگزشت الفاظ'' کے نام گنوائے ہیں[1] ۔ مولوی محمد اسماعیل پانی پتی نے بھی ''نقوش'' کے لاہور نمبر میں اسی بیان کو دہرایا ہے[2] ۔

ان حضرات کے علاوہ کسی اور نے مولوی صاحب کی تصانیف کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ۔ راقم الحروف نے اُن کی گیارہ تصانیف اور دو تراجم کا سراغ لگایا ہے ۔ اگر مزید چھان بین کی جائے تو اور بھی تصانیف کی نشاندہی کی جا سکتی ہے ۔

مولوی صاحب نے زیادہ تر تاریخی موضوعات پر لکھا ہے ۔ تیرہ کتابوں میں سے دو ادبی و لسانی موضوعات پر ہیں ۔ ایک کا موضوع معلوم نہ ہو سکا اور باقی دس تاریخی موضوعات پر ہیں ۔ ان تصانیف و تراجم کے نام یہ ہیں :

(۱) ابو المظفر محی الدین اورنگ زیب (۲) افواج دنیا (ترجمہ) (۳) اسرار حرم (ترجمہ) (۴) حیات ٹوڈرمل (۵) جلال الدین اکبر (۶) در مکنوم (حیات زیب النساء) (۷) مہاتما بدھ (۸) شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ (۹) لیلیٰ یا محاصرہ غرناطہ (۱۰) ابوالفضل کی سوانح عمری (۱۱) سوانح عمری حاتم طائی (۱۲) سرگزشت الفاظ (۱۳) اقبال ۔

۱۔ ''تاریخ اقوام کشمیر'' دوسرا ایڈیشن ، ۱۹۳۴ء ، صفحات ۵۴۲-۵۴۳ ۔
۲۔ ''نقوش'' لاہور نمبر ، صفحہ ۹۱۵ ۔

چار مزید کتابیں ایسی ہیں کہ جن کے بارے میں پورے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مولوی احمد دین کی تصانیف ہیں یا نہیں ۔ ان میں سے ایک کتاب ''حیات ٹوڈرمل'' کے سرورق ۲ اور ۳ پر دس کتابوں کا اشتہار ہے ۔ کسی کتاب کے ساتھ مصنف کا نام نہیں ہے ، لیکن ان میں سے چھ یقینی طور پر مولوی صاحب کی ہیں جو راقم الحروف کی نظر سے گزر چکی ہیں یا دوسرے ذرائع سے ان کا مولوی احمد دین کی تصنیف ہونا ثابت ہے ۔ باقی چار کتابیں یہ ہیں :

(۱) ملا دو پیازہ (۲) دوست محمد خاں (۳) راجہ بیربر (۴) حیات نور جہاں و جہانگیر ۔

عبداللہ قریشی صاحب نقوش لاہور نمبر صفحہ ۱۰۰۰ کے حوالہ سے حیات ٹوڈر مل ، راجہ بیربر اور حیات نور جہاں و جہانگیر منشی محمد الدین فوق کی تصانیف بتاتے ہیں ۔ صرف ایک کتاب 'دوست محمد خاں' میری نظر سے گزری ہے ۔ اس پر مصنف کے نام کی جگہ ''مولفہ کارپردازان دفتر اردو اخبار لاہور'' لکھا ہے ۔ جہاں تک اس کتاب کے انداز تحریر کا میں نے تجزیہ کیا ہے ، یہ مجھے مولوی صاحب ہی کی تالیف معلوم ہوتی ہے ۔ شاید کسی مصلحت کی بنا پر ان کا نام نہ دیا گیا ہو ۔ کتاب کے سرورق پر مطالب کتاب کا جو خلاصہ دیا گیا ہے ، وہ یہ ہے :

''سلطنت افغانستان کے مختصر حالات ۔ ابدالی خاندانی کے کمزور بادشاہوں کے عہد سلطنت میں اس کی تباہی ، فتح خاں کی ہمت کوشش اور افغانستان کی اصلاح ، اس کا دردناک انجام ، دوست محمد خاں اور کے بھائیوں کی خانہ جنگیاں ، دوست محمد خاں کا امیر کابل ہونا ، انگریزوں کا شاہ شجاع کو تخت نشین کرنا ، دوست محمد خاں کا اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کرنا ۔ اکبر خاں اس کے بیٹے کا انگریزی سپاہ کا صفایا کرنا ، دوست محمد خاں کی واپسی وغیرہ کے دل چسپ اور تاریخی حالات ۔''

یہ کتاب ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے مطبع 'اردو اخبار' کی طرف سے شائع کیا گیا تھا ۔

محولہ بالا اشتہار میں بقیہ تین ''مشتبہ'' کتابوں کی جو تفصیل دی گئی ہے ، اسے یہاں نقل کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا :

(۱) **ملا دو پیازہ** : ابوالمظفر ''ملا دو پیازہ'' کے حالات زندگی ایسے مذاق آمیز پیرایے میں بیان کیے گئے ہیں کہ انسان ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جائے اور ہاں حالات بھی تو ایسے شخص کے ہیں جو مذاق مجسم تھا ۔

(۲) **راجہ بیربر** : اکبر کے دربار میں ابوالظرافت ''بیربر'' کی جو عزت ہوتی

تھی اس کا شہرہ ہر ایک نے سنا ہوگا ۔ اگر صحیح حالات معلوم کرنے ہوں تو راجہ بیربر کا مطالعہ فرمائیں ۔

(۳) **حیات نور جہان و جہانگیر** : ہندوستان کی حسین ملکہ ''نور جہاں'' اور مشہور حسن پرست بادشاہ شہنشاہ ''جہانگیر'' کے مکمل اور صحیح حالات نہایت معتبر اور چیدہ مورخوں کے اقوال ، غلط بیانی کی تردید ۔

مولوی صاحب کی جو تصانیف دریافت کی جا سکی ہیں ، ان میں سے بیشتر ادارہ ''اردو اخبار'' کی طرف سے شائع ہوئی تھیں ۔ ان میں سے کسی کتاب پر بھی سال تصنیف یا سال طباعت درج نہیں ہے ۔ ذیل میں مولوی صاحب کی تصانیف کا جو جائزہ پیش کیا جا رہا ہے ، اس میں ''پیسہ اخبار'' کے ادارے کی طرف سے شائع شدہ کتابوں کے بعد اردو اخبار کی شائع کردہ کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد سن وار ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔

ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب : جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ، اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۱ء سے پہلے شائع ہو چکا تھا ۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۴ء میں کارخانہ 'پیسہ اخبار' کی طرف سے شائع ہوا اور یہی راقم الحروف کے پیش نظر ہے ۔ یہ ۱۳۶ صفحات کی کتاب ہے جس میں اورنگ زیب کے حالات اور اس کے عہد کے معاشرتی و سیاسی واقعات بیان کیے گئے ہیں ۔ مولوی صاحب نے دیباچے میں تفصیل سے اس کتاب کی وجہ تصنیف بیان کی ہے ۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اورنگ زیب پر جو مختلف نوعیت کے الزمات لگائے جاتے ہیں وہ اُن مغربی سیاحوں کے بیانات کا نتیجہ ہیں جنھوں نے کچھ عرصے ہندوستان میں قیام کرنے کے بعد بلا تحقیق اپنے خیالات کو تاریخی صداقت بنا کر پیش کیا ۔ مولوی صاحب نے ایسے سیاحوں ، خصوصاً برنیر کے بعض بیانات بطور نمونہ پیش کرکے بتایا ہے کہ یہ سیاح ہندوستان اور یہاں کے باشندوں کو کس حد تک سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے ۔ ان سیاحوں کے بیانات کو مغربی مورخوں نے بھی بلا چون و چرا تسلیم کر لیا اور اس طرح اورنگ زیب کی ایک ایسی تصویر پیش کی جو اصل سے کوئی مطابقت نہ رکھتی تھی ۔ مولوی صاحب کا خیال ہے کہ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مغربی مورخین فارسی زبان سے نابلد تھے لہٰذا وہ اصل ماخذ کو پڑھنے اور سمجھنے کی زحمت گوارا نہ کر سکے اور اس بنا پر ان کی تصانیف حقیقت سے دور ہو گئیں ۔ اورنگ زیب سے مغربی مورخین کی نا انصافی کی ایک وجہ انھوں نے یہ بھی بیان کی ہے :

''کسی شہنشاہ ہند کی تاریخ لکھنے کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ اس کا مورخ ہند کے قومی و ملکی حالات سے بخوبی ماہر ہو اور جب تک ان حالات سے کسی

شخص کو پوری واقفیت نہ ہو اس کی کتاب اپنے ہیرو کے کریکٹر کا پورا آئینہ نہیں ہو سکتی ۔ اورنگ زیب کے یورپین مورخین اس امر میں بھی قاصر تھے ۔ انھوں نے اورنگ زیب کا کریکٹر لکھنے کے وقت اپنی قوم اور ملت کی عادات و خیالات کو جو ان کے طبعی ہیں ، مقیاس ٹھہرایا ہے اور اس مقیاس سے اس کا اندازہ کرنے میں وہ سیدھی راہ سے کہیں دور جا پڑتے ہیں ۔''[1]

مولوی صاحب نے ان مورخین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے خیال سے یہ سوانح عمری لکھی ۔ انھوں نے الزامات کو دور کرنے پر ساری توجہ صرف نہیں کی بلکہ اورنگ زیب کی داستانِ حیات کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ خود بخود ہر الزام کی قلعی کھلتی چلی جاتی ہے ۔ اورنگ زیب پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ اس نے راجپوتوں ، مرہٹوں اور دکنیوں کو بلا وجہ نشانۂ ستم بنایا ۔ مولوی صاحب نے اُن تمام حالات و واقعات کا مورخانہ بصیرت کے ساتھ تجزیہ کیا ہے جن کی بنا پر اورنگ زیب ان تینوں کے خلاف نبردآزما ہوا ۔ یہ کتاب اورنگ زیب کی ایک غیر جاندارانہ تصویر پیش کرتی ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنف کی اپنے موضوع سے عقیدت جا بجا نظر آتی ہے لیکن یہ عقیدت اظہار حقیقت میں کہیں رکاوٹ نہیں بنتی ۔

اسی موضوع پر شبلی نعمانی کی کتاب ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' مولوی احمد دین کی کتاب کی اشاعت کے کئی سال بعد ۱۹۰۸ء میں منظر عام پر آئی ۔ شبلی نے صرف 'اورنگ زیب' پر عائد شدہ الزامات کو رد کیا ہے مکمل سوانح عمری نہیں لکھی لیکن مولوی احمد دین نے 'اورنگ زیب' کی پوری زندگی کی تصویر کشی کی ہے اور اسی ضمن میں متعصب مورخین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا ہے ۔ اس اعتبار سے دونوں کتابوں کا موضوع بڑی حد تک ایک ہی ہے اور ان میں خاصی مماثلت پائی جاتی ہے ۔ یہاں تک کہ بعض الزامات کی تردید میں دونوں نے یکساں انداز اختیار کیا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تحقیقی اعتبار سے شبلی کا پلہ بھاری ہے لیکن یہ خیال کرنا بے جا نہ ہوگا کہ شبلی نے جب اپنی کتاب لکھی ہوگی تو احمد دین کی تصنیف (جو اردو میں 'اورنگ زیب' کی پہلی مکمل سوانح عمری ہے) ضرور ان کے پیش نظر رہی ہوگی اور ویسے بھی جن دنوں میں یہ کتاب شائع ہوئی تھی ، اس زمانے میں شبلی لاہور ہی میں مقیم تھے ۔

مولوی احمد دین کی کتاب کو اپنے زمانے میں خاصی شہرت ملی مگر

۱۔ دیباچہ ''اورنگ زیب عالمگیر'' مصنفہ احمد دین ، ۳ ۔

شبلی کی کتاب کی اشاعت کے بعد اس کی اہمیت کم ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہ نقش و نگار طاق نسیان بن گئی ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ نصف صدی میں 'اورنگ زیب' پر بہت کام ہوا ہے لیکن آج بھی اس کتاب کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں ۔ مولوی صاحب کی کتاب نے اورنگ زیب کی شخصیت کو سمجھنے میں جو کارنامہ انجام دیا ہے ، اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

افواج دنیا : یہ ۲۹۶ صفحات کی ایک کتاب ہے جو انگریزی کی کسی تصنیف کا ترجمہ ہے ۔ یہ ۱۹۰۱ء میں مطبع خادم التعلیم پنجاب لاہور کی طرف سے شائع ہوئی تھی ۔ اس کا موضوع دنیا کے مختلف ممالک (مثلاً آسٹریا ، بلجیم ، برازیل ، بلگیریا ، چلی ، چین ، ڈنمارک ، مصر ، انگلستان وغیرہ) کی افواج سے متعلق ہے ۔ ہر ملک کی فوج کی خصوصیات تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں ۔ ابتداً ایک فرہنگ اصطلاحات ہے جس میں تقریباً چالیس انگریزی اصطلاحات کی تشریح مترجم کی طرف سے دی گئی ہے ۔ ترجمہ رواں دواں اور شگفتہ زبان میں ہے ۔

اسرار حرم : یہ رینالڈس کے ناول ''دی لوز آف دی حرم'' کا اردو ترجمہ ہے جسے حکیم رام کشن جنرل بک مرچنٹ ، کٹرہ تارکشاں ، لوہاری گیٹ لاہور نے شائع کیا تھا ۔ یہ ترجمہ ۲۱۱ صفحات پر مشتمل ہے ۔ مولوی صاحب نے لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ اصل کے مطالب کو اختصار اور خالص تخلیقی انداز میں پیش کیا ہے ۔ ابتدا میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۳ء کی لکھی ہوئی ، مولوی صاحب کی مختصر سی یہ تمہید بھی ہے :

''ناظرین ! آپ کی تفریح طبع کے لیے انگلستان کے جادو نگار ناولسٹ رینلڈس کے ایک نہایت عمدہ ناول ''دی لوز آف دی حرم'' کو اردو قالب میں پیش کیا جاتا ہے ۔ اس خیال سے کہ آپ کی طبیعت پر اس کا مطالعہ شاق نہ گزرے ، ہم نے اختصار اور دلچسپی کو مد نظر رکھا ہے اور آپ کو روزمرہ کی دلکش اردو زبان میں اس کا ویسا ہی مزہ آئے گا جیسا کہ رینلڈس کی اصلی زبان پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے ۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد آپ بخوشی ''اسرار حرم'' کے مطالعہ میں مشغول ہوں ۔''

حیات ٹوڈرمل : اس میں شہنشاہ اکبر کے وزیر راجہ 'ٹوڈرمل' کے حالات زندگی دیے گئے ہیں ۔ ۲۵ صفحات کی اس مختصر سی کتاب میں 'ٹوڈرمل' کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے ۔ اس کی فوجی اور انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس کی ذہانت اور علمی دلچسپیوں کی روداد بھی پیش کی گئی ہے ۔ اس کتاب میں مولوی احمد دین نے اپنے استاد مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف ''دربار اکبری'' سے خاصا استفادہ کیا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا

کہ یہ کتاب در اصل ''دربار اکبری'' ہی کے فیضان کا نتیجہ ہے ۔ اسے منشی رام اگروال تاجر کتب ، مہتمم کتب خانہ تعلیم پنجاب و پروپرائٹر اردو اخبار انار کلی لاہور نے فیض عام پریس ، لاہور سے طبع کرا کے شائع کیا تھا ۔

جلال‌الدین محمد اکبر : راقم‌الحروف کے سامنے کتاب کے دو ایڈیشن ہیں ، لیکن دونوں پر تاریخ طباعت درج نہیں نیز یہ صراحت بھی نہیں ملتی کہ پہلا ایڈیشن کون سا ہے اور دوسرا کون سا ۔ دونوں مرتبہ یہ کتاب منشی رام اگروال تاجر کتب ہی نے شائع کی ۔ دونوں ایڈیشنوں میں کوئی فرق نہیں ، سوائے اس کے کہ ایک ایڈیشن کے صفحات ۱۳۵ ہیں اور دوسرے کے ۱۳۶ ۔ اس کتاب کے مختصر سے دیباچے میں موضوع اور مآخذ پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے :

''موجودہ سوانح عمری میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس مشہور و معروف بادشاہ کے کارناموں ، ایجادوں ، انتظام ، فتوحات وغیرہ کو اختصار سے قلم‌بند کیا جائے ۔ اس مختصر سی لائف کے مطالع سے ناظرین پر خود واضح ہو جائے گا کہ خاکسار مولف کو اس کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے ۔ وہ اس کی مدح سرائی میں ایک حرف بھی لکھنا نہیں چاہتا اور ''مشک آن است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید'' کے مقولہ پر عمل کر کے ہمایوں کے سعادت‌مند بیٹے اور بابر کے نامور پوتے کے حالات پبلک کے سامنے پیش کرتا ہے ۔ اصحاب بینش اور اہل دانش سے قدردانی کی امید ہے ۔ اس لائف میں مندرجہ ذیل تاریخوں سے مدد لی گئی ہے ۔ مولف نے اپنی طرف سے کوئی خیالی یا بے سر و پا امر ایزار نہیں کیا ۔ جو کچھ لکھا ہے محولہ تاریخوں کی سند پر لکھا ہے خواہ ان تاریخوں کا نام ہر ایک مقام پر نہ بھی دیا گیا ہو ۔

دربار اکبری مولفہ مولوی محمد حسین صاحب آزاد ۔ سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور ۔ جے ٹالبائے وھیلر کی تاریخ ہند تاریخ ہند مولفہ لیتھبرج (اردو) ۔ سر ایڈورڈ سایوان بارٹ کی تاریخ موسومہ ہندوستان کے فاتح ، جنگجو اور مدبر ۔ فریڈرک اگسٹس لونٹ نوئر کی تاریخ انگریزی ''شہنشاہ اکبر'' ۔

مولف کو اس بات کا افسوس ہے کہ بعض دل چسپ باتیں جو طویل تاریخوں میں دی گئی ہیں اس سوانح عمری میں اختصار کو مد نظر رکھ کر قلم انداز کرنی پڑی ہیں ۔''

لیلی یا معاصرہ غرناطہ : یہ کتاب راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزری ۔ اس کی اطلاع ''حیات ٹوڈرمل'' کے سرورق سے ملتی ہے جہاں مصنف کے نام کے ساتھ اس کی چند تصانیف کے نام بھی درج کیے گئے ہیں ۔ بظاہر یہ کتاب کوئی تاریخی ناول معلوم ہوتی ہے ۔ ممکن ہے ''اسرار حرم'' کی طرح یہ بھی کسی کتاب کا ترجمہ ہو ۔

ذیل کی تین کتابیں بھی میری نظر سے نہیں گزریں ۔ حیات ٹوڈرمل کے اندرونی سرورق پر ان کا اشتہار ہے ۔ اس اشتہار میں ان کتابوں کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے ، وہ یہ ہے :

در مکتوم یعنی حیات زیب النساء : ''شہنشاہ عالم گیر کی پیاری بیٹی زیب النساء کی ابتدائی زندگی ، ذہانت و جودت ، تحصیل علم ، شاعرانہ مذاق ، مشاعروں کی کیفیت ، عشق و محبت کے چرچے ، شادی کی تجویزیں ، بیگم کا شادی سے انکار ، اس کی حاضر جوابیاں ، عاقل خاں صوبہ دار لاہور سے پاک محبت اور اس کا مہلک نتیجہ ، بیگم کی قید ، شاعری اور وفات نہایت ولولہ انگیز بیان میں تحریر کی گئی ہے ۔''

مہاتما بدھ : ''ساکی منی یا گوتم کی سوانح عمری ۔ جس میں کپل وستو کے شہزادہ کی ابتدائی تعلیم دنیا سے نفرت ، غور و فکر ، والدین کے مشورے سے شادی کرنے (کذا) اس کی بیوی کی عفت و عصمت اور اطاعت ، اس کے چار عبرت بخش نظارے دیکھ کر دنیا سے قطع تعلق کرنے (کذا) فقیرانہ ریاضت تلاش حق ، معرفت ، جدید مذہب کی تلقین ، ہزارہا باشندوں کے پیرو ہونے کے حالات اس عمدگی سے حوالہ قلم کیے گئے ہیں کہ ناظرین بے ساختہ تعریف کریں ۔''

شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ : ''سکھوں کے مذہب کا آغاز ، اس کے بانی گرونانک صاحب اور دیگر گروہوں کے مختصر حالات ۔ سکھوں کی لوٹ مار اس مذہب کا نشو و نما اور سکھوں کی قوم کا رفتہ رفتہ ترقی کرنا ، سکھ سرداروں کا پنجاب و ہندوستان کے اکثر علاقوں پر قابض ہونا ، رنجیت سنگھ کے آباو اجداد اور خود اس کا ان سرداروں کو مطیع کرنا ، اس کی شجاعت و لیاقت ، مہمات ، انتظام ، فوج اور سلطنت کی صحیح صحیح کیفیت ۔''

سوانح عمری حاتم طائی : یہ ۱۹ صفحات کا ایک رسالہ ہے جس میں حاتم کے مختصر حالات اور چھ حکایتیں درج ہیں ۔ ناشر اور سال طباعت کی صراحت سرورق پر ان الفاظ میں کی گئی ہے :

حکیم رام کشن مالک تجارتی کتب خانہ و کارخانہ جڑی بوٹی (پنجاب) نے ۱۹۱۶ء میں ہندوستان اسٹیم پریس لاہور میں بہ اہتمام گوراندتا مل بہار دواجیہ ، پرنٹر و پبلیشر سے چھپی ۔

ابوالفضل کی سوانح عمری : یہ ۳۲ صفحات کی مختصر سی کتاب ہے جس میں ابوالفضل کے حالات زندگی پیش کیے گئے ہیں ۔ اسے پندرہ ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ جن میں ابوالفضل کی پیدائش سے وفات تک کے تمام اہم واقعات

کو اجمالاً لکھا گیا ہے ۔ مصنف نے تمام ضروری معلومات اس انداز سے دی ہیں کہ موضوع کی زندگی کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوا ۔ ابوالفضل کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں پر بھی نظر ڈالی ہے اور جہاں ایک طرف اس الزام کی تردید کی ہے کہ وہ محض اکبر کا ایک خوشامدی تھا وہیں دوسری طرف یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اس نے علماء کی مخالفت کر کے کچھ اچھا نہیں کیا ۔

میرے پیش نظر اس کتاب کا جو نسخہ ہے اس کا سرورق ضائع ہو چکا ہے ۔ آخری صفحے پر چند کتابوں کا اشتہار ہے جس کے نیچے ''فضل الدین تاجر کتب قومی و مہتمم اخبار اشاعت لاہور کشمیری بازار'' درج ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب اسی ناشر نے شائع کی ہوگی ۔ کتاب کے آخر میں مصنف کا نام ''احمد الدین لاہوریہ لکھا ہے ۔

سرگزشت الفاظ : یہ کتاب مولوی صاحب کی تصانیف ہی میں نہیں اردو ادب میں بھی ممتاز حیثیت رکھتی ہے ۔ یہ اپنے موضوع پر پہلی اور (اب تک آخری بھی) مستقل تصنیف ہے ۔ سب سے پہلے مولوی محمد حسین آزاد نے اس موضوع پر لکھا ، مولوی احمد دین نے اپنے استاد ہی کی پیروی میں اس موضوع کو اپنی کتاب میں تفصیل سے پیش کیا ۔ یہ کتاب مولانا آزاد ہی کے نام منسوب ہے ۔ اس انتساب کے سلسلے میں ''سرگزشت الفاظ'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

''مولانا مولوی محمد حسین آزاد کا نام نامی زیب عنوان کیا ہے اور اس لیے کہ مولانا ادبیات اردو میں سلاست زبان ، لطافت بیان اور لفظوں میں جان ڈال کر جیتی جاگتی تصویریں نظروں کے سامنے کھڑی کر دینے میں تا حال بے مثال ہیں ۔ زبان اُردو میں مولانا علم اللسان اور تحقیقات لفظی میں پیش رو ہیں ۔ مولف کو مولانا کی شاگردی کا فخر حاصل ہے اور مولانا کی تصانیف سے کہیں کہیں اقتباسات بھی دیے گئے ہیں ۔''[1]

یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی ۔ حکومت پنجاب کے محکمہ تعلیم نے اسے ۱۹۲۳ء میں صوبے کی بہترین تصنیف قرار دے کر مصنف کو ساڑھے سات سو روپے کا انعام دیا تھا اور ٹکسٹ بک کمیٹی پنجاب نے صوبے کے مدارس کے کتب خانوں کے لیے اس کے سوا تین سو نسخے خریدے تھے ۔[2]

مولوی احمد دین کو تحقیقات لفظی سے ابتدا ہی سے دلچسپی تھی ۔ انھوں

۱۔ ''سرگزشت الفاظ'' مطبع کریمی لاہور ، طبع اول ، ۴ ۔

۲۔ کتاب ''اقبال'' کے آخری سرورق پر ''سرگزشت الفاظ'' کا اشتہار ہے ۔ یہ تمام معلومات اسی اشتہار سے لی گئی ہیں ۔

نے اس کتاب کی داغ بیل ۱۹۰۱ء ہی میں ڈال دی تھی جب کہ ''مطالعہ' الفاظ'' کے عنوان سے ان کا ایک مقالہ دو قسطوں میں ''مخزن''[1] میں شائع ہوا تھا۔ گویا ۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۳ء تک وہ اس موضوع پر غور و فکر کرتے اور مواد جمع کرتے رہے اور اس طرح بائیس برس کی محنت کے بعد ''سرگزشت الفاظ'' وجود میں آئی۔ مولوی صاحب نے دیباچے میں بتایا ہے کہ انھوں نے پادری ٹرپچ کی کتاب ''مطالعہ' الفاظ'' کو اپنے سامنے رکھا :

''اس پیش کش میں ''مطالعہ' الفاظ'' کا طرز بیان ہی قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور جہاں تک ممکن تھا پادری صاحب موصوف کے سلسلہ' تحریر کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ البتہ انگریزی، فرانسیسی، لاطینی الفاظ کی بجائے اردو، ہندی، فارسی اور عربی کے الفاظ منتخب کئے گیے ہیں۔''

راقم الحروف کو ٹرپچ کی کتاب دستیاب نہیں ہو سکی ورنہ دونوں کتابوں کے موازنے سے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ مولوی صاحب نے ٹرپچ سے کہاں تک استفادہ کیا ہے۔ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ احمد دین نے ٹرپچ کی کتاب کا چربہ اتارا ہے۔ ترتیب بھی وہی ہے اور انداز بیان بھی قریب قریب اسی طرح کا ہے۔[2]

بہرحال یہ طے ہے کہ مولوی احمد الدین نے ٹرپچ کی کتاب کو بطور نمونہ سامنے رکھا، البتہ الفاظ کی تحقیق ان کی ذاتی کاوش و محنت کا نتیجہ ہے اور اسی بنا پر اس کتاب کا علمی پایہ بلند ہے اور اسے بے انتہا مقبولیت ہوئی۔

یہ کتاب سات فصلوں پر مشتمل ہے جن میں ایک ہزار سے زائد الفاظ کی اصل سے بحث کی گئی ہے۔ ان میں سے بیش تر الفاظ فارسی الاصل ہیں۔ ابتدا میں مصنف نے یہ بتایا ہے کہ الفاظ کس طرح مختلف اوقات میں اپنے معانی بدلتے رہتے ہیں، کبھی وہ عروج سے زوال کی طرف آتے ہیں اور کبھی زوال سے عروج کی طرف۔ پہلی دو فصلوں میں زبان اور الفاظ کی حقیقت کے بارے میں تمہیدی باتیں لکھی ہیں اور اسی ضمن میں بعض الفاظ کی اصل بطور مثال بیان کر دی ہے۔ زبان کو متحجر نازک خیالی سے تشبیہ دے کر لکھا ہے کہ اس کے دامن میں بہت سے تاریخی اور اخلاقی حقائق ملتے ہیں جن سے واقف ہونے کے لیے مطالعہ' الفاظ بہت ضروری ہے۔ زبان کے آغاز اور ارتقا پر بھی روشنی ڈالی ہے اور یہ کہا ہے کہ زبان قومی ترقی کے ساتھ ہی ترقی کرتی ہے۔ الفاظ کو

۱۔ ''مخزن'' لاہور، بابت ماہ اپریل دسمبر ۱۹۰۱ء۔
۲۔ رسالہ ''اردو'' بابت اپریل ۱۹۲۳ء، ۳۵۵۔

مصنف نے ایسے استعاروں سے تعبیر کیا ہے جو کثرت استعمال کی وجہ سے بادی النظر میں اُس حسن کے حامل نظر نہیں آتے جو ان میں کارفرما ہوتا ہے ۔ اس سلسلے میں انھوں نے ''کہکشاں'' ''تہذیب'' اور ''قوس قزح'' وغیرہ کی مثالیں دی ہے ۔

تیسری فصل میں الفاظ کی اخلاقی حیثیت پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ الفاظ اخلاق اسباق کا خزانہ ہیں ۔ یہ انسان کے اخلاقی انحطاط اور عروج کی داستان سناتے ہیں اور جس طرح انسان عروج و زوال کی منزلیں طے کرتا ہے اسی طرح الفاظ سرگرم سفر نظر آتے ہیں ۔ چوتھی فصل میں الفاظ اور تاریخ کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ کس طرح لفظی تحقیق ، تاریخی حقائق کو بے نقاب کر سکتی ہے ۔ پانچویں فصل میں ''نئے الفاظ'' پر بحث کی گئی ہے یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ بعض اشیا یا شہروں کے نام پہلی بار کس طرح رکھے گئے اور پہلے پہل ان کا استعمال کن وجوہ کی بناء پر ہوا ۔ نئے الفاظ کے وجود میں آنے کے سلسلے میں انھوں نے بتایا ہے کہ مقبول عام تحریکیں نئے الفاظ وجود میں لاتی ہیں اور پھر مولانا آزاد کے حوالے سے (صفحہ ۱۸۷) یہ بھی لکھا ہے کہ بعض دفعہ ممتاز افراد بھی کسی خاص مفہوم کو ادا کرنے کے لیے الفاظ وضع کر لیتے ہیں نیز زمانے کی نئی ضرورتیں بھی الفاظ کی ایجاد میں حصہ لیتی ہیں ۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں :

''زمانہ حال کی نئی ضرورتوں نے پچھلے چند سالوں میں ہی زبان میں کئی ایک نئے الفاظ پیدا کر دیے ہیں ۔ سیاسی تحریک کی رو نے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایشیائی ممالک کو تہ و بالا کر دیا ہے اور اہم تغیرات سیاسی اور نظامی جو وقوع میں آئے ہیں انھوں نے نئے الفاظ ہر ایک ایسی مملکت کی زبان کو دیے ہیں اور چونکہ ہندوستان کی زبان ان ممالک کی زبانوں سے ایک واسطہ رکھتی ہے یہاں بھی اسی تحریک کی کمزور لہروں نے ان نئے الفاظ میں سے چند ایک ادھر بھی پھینک دیے ہیں جو بخوشی چن لیے گئے ہیں ۔''[۱]

وہ زبان کو بھی انسانوں کی طرح حیات و ممات کے اصولوں کا پابند بتاتے ہیں ۔ ان کی رائے ہے : ''ایسے لوگ بھی گزرے ہیں اور ہیں جو زبان کی حقیقت اور اس کے اصولوں سے محض نا بلد ہونے کی وجہ سے جبراً اس کی ترقی کے مانع ہونے کے درپے ہوئے اور ہو جاتے ہیں ۔ انھیں خیال ہوتا ہے کہ اس کی نشو و نما کافی ہو گئی ہے یا ضروری نہیں اور اب زیادہ ترقی نہ تو درکار ہے اور

۱۔ سرگزشت الفاظ ، ۱۹۱ - ۱۹۲ ۔

نہ ہونی چاہیے لیکن انھیں معلوم نہیں کہ زبان میں بھی زندگی کے ویسے ہی اجزاء ہیں جیسے کہ انسان میں یا درخت میں ۔ انسان کی طرح اس کا نشو و نما مکمل ہوگا ۔ ہاں اگر کوئی بیرونی اسباب زبردستی سے اس کی زندگی کا پیش از وقت خاتمہ کر دیں تو اور بات ہے اور انسان کی طرح ہی اس کی زندگی اصول زوال کے تحت میں بھی ہے ۔ جنگل کے درخت کی طرح جب تک اس میں نشو و نما کی طاقت ہے یہ ہر ایک کمزور رکاوٹ کو جو اس کے پھیلاؤ میں بارج ہوگی ۔ بے اعتنائی کی نظر سے دیکھے گی اور درخت کی طرح ہی پرانے پتے جھاڑے گی اور نئے پتے نکالتی رہے گی ۔ اس طرح کی سب کوششیں زبان کو ایک حد پر محدود کر دینے میں ناکامیاب رہی ہیں ۔ ایسے حالات میں بھی جو کامیابی کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ہو سکتے تھے زبان کے نشو و نما کی آب یاری عوام کے منہ میں ہے ۔ فیشن کا خاص لوگوں سے عوام میں آنا تو درست لیکن الفاظ ، وہ الفاظ جو زبان کے خزانے میں حقیقی ایزاری دولت کا باعث ہیں عوام سے خواص میں جاتے اور پھیلتے ہیں اور ان میں اکثر ، کوئی کوتاہ اندیش ادیب ان کی خواہ کتنی ہی مخالفت کرے یا انھیں جب تک چاہے نظر انداز کرے زبان میں اپنی جگہ باصرار لیں گے اور اس پر قائم رہیں گے اور وہاں سے انھیں نکالنا یا ہٹانا ناممکن ہے ۔ دنیا کے ادیب ، علما و فضلا بے شک اپنا زور لگا کر دیکھ لیں دنیا برابر آگے کو جا رہی ہے اور زبان کو بھی اس کے ساتھ ساتھ جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ۔''[۱]

چھٹی فصل میں مترادف الفاظ سے بحث کی گئی ہے ۔ انھوں نے تفصیل سے ان امور کی نشان دہی کی ہے جو مترادف الفاظ کو وجود میں لانے کے ذمہ دار ہیں ۔ مترادف الفاظ میں جو معانی کا نازک فرق ہوتا ہے اس کی وضاحت بھی کی ہے نیز ان الفاظ سے حاصل ہونے والے اخلاقی فائدے بھی گنوائے ہیں ۔ اس بحث میں انھوں نے بہت دلچسپ پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''بعض اوقات مترادف الفاظ کا استعمال اخلاقی فائدے سے خالی نہیں ہوتا ۔ جو کچھ ہمارے دل میں ہوتا ہے وہی ہم زبان سے نکالتے ہیں اور اس طرح ان مترادف الفاظ کی مدد سے ہم اپنے اظہار خیالات میں منافقت کے گناہ سے بچ جاتے ہیں ۔ کسی امر کی تائید کرتے ہوئے ضروری نہیں کہ ہم دل سے اس کی راستی کے قائل ہوں اور نہ ہی ہم تائید میں کوئی ایسا خیال ظاہر کرتے ہیں لیکن اگر ہم کسی امر کی تصدیق کر رہے ہوں گے تو ہم صاف صاف بتا رہے ہوں گے کہ ہم خود دل سے اس کے قائل ہیں اور دل سے موید ۔''[۲]

۱- سرگزشت الفاظ ، ۲۰۶ - ۲۰۷ - ۲- ایضاً ، ۲۴۸ -

آخری فصل میں ''مدرس اور الفاظ'' کے عنوان سے بتایا ہے کہ تعلیمی ترقی کے لیے زبان کو اچھی طرح جاننا ضروری ہے۔ الفاظ کے ذریعہ طالب علم بہت کچھ سیکھ سکتا ہے لیکن اس سلسلے میں بے احتیاطی نہایت مضر ثابت ہو سکتی ہے۔ فاضل مصنف ''بے تکی تحقیقات'' سے پرہیز کا مشورہ دیتے ہوئے الفاظ سے ''غفلت شعاری'' کو ''نا قابل در گذر گناہ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ الفاظ کی ظاہری صورت بھی بعض اوقات دھوکہ دیتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں :

''تحقیقات کی کامیابی کے لیے ظاہریت اور دھوکا دینے والی شکل و صورت سے پرہیز کرنا لازمی ہے۔ ظاہری صورت کو بالائے طاق رکھ کر اصل چیز تک پہنچنا اور اسے قابو میں لانا ضروری ہے۔ الفاظ کا بہروپ رنگ کا ہے اور اس کی ماہیت معلوم کرنے کے لیے مستحکم ارادہ اور استقلال طبیعت درکار ہے۔ محنت اور تکلیف سے ہی الفاظ سے حسب منشا اور سچا جواب مل سکتا ہے ورنہ نہیں۔ پوچھنے والا ادھر اُدھر کے جوابات سے نہیں ٹلے گا۔ انھیں چھوڑنے کا نہیں۔ مضبوط ہاتھ سے پکڑے رکھنے پر مصر ہوگا تاوقتیکہ اصل روپ میں نمودار نہ ہوں اور سوالات کا سیدھا جواب نہ دیں۔''[1]

اسی ضمن میں الفاظ کے ہجوں کو اصوات کے مطابق لکھنے کی تجویز کی وہ مخالفت کرتے ہیں اور اس کے نقصانات گنواتے ہیں۔ مختلف الفاظ کے باہمی تعلق اور ایک ہی لفظ کے مختلف معانی میں رابطے کی بحثیں بھی اسی فصل میں آ گئی ہیں۔ مطالعہ الفاظ میں وطن پرستی اور قوم پرستی کے پہلو پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے آخر میں الفاظ اور مذہبی تعلیم پر بحث کی گئی ہے۔

مذکورہ سطور میں پوری کتاب کا ایک دھندلا سا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک ناول کی طرح دلچسپ ہے اور یہ دلچسپی خالص علمی و فنی معاملات پر بحث کرتے ہوئے بھی قائم رہتی ہے۔ مصنف کا انداز تحریر نہایت شگفتہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی گفتگو کر رہا ہو۔ ایک مثال ملاحظہ ہو :

''پچھلی فصل میں ہم نے بیان کیا تھا۔ نہیں نہیں ہم ایک ایسی عمدہ بات کے موجد ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے، ہم نے ایک بزرگ کا مقولہ نقل کیا تھا کہ زبان نازک خیالی' متحجر ہے۔ یہ سچ ہے کہ نازک خیالی کا جادو جو الفاظ میں بھرا پڑا ہے۔ ہم پر کچھ اثر نہیں کرتا اور اگر کبھی کوئی اثر ہوتا بھی ہے تو بہت کم۔ مدت کی واقفیت اور قدرے کم توجہی نے ہمیں الفاظ کی خوبیاں محسوس کرنے اور ان سے لطف اٹھانے سے محروم کر دیا ہے۔ کبھی کسی نے یہ خوبیاں ہمیں جتلانے کی پروا نہیں کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا اور اس کے سوا اور ہونا بھی

۱۔ سرگزشت الفاظ، ۲۷۴ - ۵ -

احمد دین نے اقبال کی مشکل گوئی اور سادہ بیانی کے سلسلے میں بتایا ہے کہ ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' اس لیے آسان زبان میں ہیں کہ ان کا تعلق عام مسلمانوں کے جذبات سے ہے ۔ ''شمع و شاعر'' کا تعلق عام مسلمانوں سے نہیں ، ان مسلمانوں سے ہے جو قوم کی رہنمائی کرتے ہیں ۔ اس لیے اس کا اسلوب بدلا ہوا ہے ۔ اس کے بعد کلام اقبال میں ''شوکت بیان'' ، ''سوز و گداز'' ، ''تشبیہات و استعارات'' ، ''جوش'' ، ''طرفگی بیان'' اور ''موسیقیت'' کے عناصر کی نشان دہی کی گئی ہے ۔ ''امید'' کا عنوان قائم کر کے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اقبال کسی عالم میں مایوس نہیں ہوتے ۔ ان کے کلام میں ''نا امیدی کی سریں اور آہ و بکا کم یاب ہے اس کے نالے بھی نئے انداز کے ہوتے ہیں ۔ اسے شام غم بھی صبح امید کی خبر دیتی ہے اور ظلمت شب میں اسے امید کی کرن نظر آتی ہے ۔''[1]

طرز بیان کے سلسلے میں احمد دین نے سب سے اہم بحث اس موضوع پر کی ہے کہ اقبال مناظر قدرت اور مادی دنیا سے اخلاقیات ، معاشرت اور سیاسیات کے زرین اصول اخذ کرتا ہے اور مسائل فلسفہ کے ایسے نکات کا استدلال کرتا ہے ، جن سے عقل حیران رہ جاتی ہے ، مضمون آفرینیاں دلفریب اور حیرت انگیز ہیں[2] ۔ اس موضوع پر احمد دین نے جو کچھ لکھا ہے ، وہ ان کی نقادانہ بصیرت کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے ۔ کلام اقبال کے اس پہلو پر آج تک کسی نقاد نے اس انداز سے روشنی نہیں ڈالی ۔ احمد دین نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اقبال جب بھی کسی قومی و ملکی مسئلے پر یا انسانی زندگی کے کسی پہلو پر اظہار رائے کرتے ہیں اور انسانی فطرت کی پیچ در پیچ گتھیوں کو سلجھاتے ہیں تو خود فطرت ہی ان کے لیے ایسی مثالیں مہیا کر دیتی ہے جن سے ان کے شاعرانہ مطالب کو سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا ہو جاتی ہے ۔ دریا ، قطرہ ، درخت کی سوکھی ٹہنی ، شبنم ، گوہر وغیرہ کے استعارے ، قومی اتحاد اور انسانی نفسیات کے بیان میں بڑی وضاحت پیدا کر دیتے ہیں ۔ اس طرح ''پھول'' کا استعارہ بھی ''چشم بینا اور گوش شنوا کے لیے اسباق کا ایک دفتر کھولے ہوئے ہے'' ۔ اقبال کو حیات انسانی کے مختلف مراحل میں جو کیفیات نظر آتی ہیں ان کے اظہار کے لیے بھی خصوصیات گل یعنی خود فروشی ، خود نمائی اور خود فراموشی وغیرہ کا سہارہ لیا جاتا ہے ۔ اسی طرح گل و گلزار کے تمام متعلقات شعر اقبال میں بہاراں کا سماں پیدا کر دیتے ہیں ۔ علو ہمتی کے بیان کے لیے بھی اقبال نے جو مثالیں دانہ ، خاک ، روئیدگی ، بالیدگی پیش کی ہیں وہ بھی آغوش فطرت ہی سے مستعار لی ہیں ۔ خودداری کے لیے بھی اقبال حباب ہی کی مثال پیش کرتے

۱۔ اقبال ، ۲۴۲ ۔ ۲۔ ایضاً ، ۲۴۳ ۔

یہ لفظ گلاب کا معرب ہے ۔ کراہت سے بچنے کے لیے مسہل کے لیے استعمال ہونے لگا ہے ۔ ''رضائی محمد رضا موجد کے نام پر ہے ۔'' جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ لفظ دراصل ''رزائی'' ہے ۔ چونکہ یہ عموماً رنگے ہوئے کپڑے کی بنائی جاتی ہے اس لیے یہ نام پڑ گیا ۔

''پاکھنڈ'' کے لغوی معنی مولف نے ''وید'' کے برخلاف ''بدعت'' بیان کیے ہیں اور اصطلاحی معنی ''وہ عبادت جو دکھاوے کی ہو حرامزدگی ، بدذاتی ، شرارت لیکن لفظ کی تحقیق سے گریز کیا ہے ۔ ''پاکھنڈ'' مرکب ہے ''پا'' اور ''کھنڈ'' سے ''پا'' کے معنی ''پالنے والے یا حفاظت کرنے والے'' کے ہیں ۔ جس سے مراد ''دھرم'' لی جاتی ہے ''کھنڈ'' کے معنی ''منتشر کرنے اور توڑنے'' کے ہیں ۔

بعض الفاظ پردہ پوش ہوتے ہیں یعنی کسی مکروہ یا ناگوار شے یا خیال کو اچھے اور خوشنما الفاظ میں ادا کرتے ہیں ۔ مولف نے ''متوالا'' کے لفظ کو بھی انہیں میں شمار کیا ہے ۔ وہ اسے ''مت'' (سمجھ ، عقل) اور ''والا'' سے مرکب سمجھتے ہیں ۔ حالانکہ یہ لفظ ''مد'' اور ''والا'' سے مرکب ہے ۔ ''مد'' کے معنی ہندی اور سنسکرت میں ''عرق'' ، ''شراب'' اور ''مستی'' کے ہیں ۔ کثرت استعمال سے د ، ت سے بدل گئی ہے ، ان دو حرفوں کا بدل باہم ہوتا ہے ۔ ''اسامی'' کے ایک معنی ''امیر'' کے بھی لکھے گئے ہیں ۔ درحقیقت یہ ''امیر'' کے معنوں میں نہیں آتا ۔ بلکہ بعض اوقات ''مالدار'' سے مراد ہوتی ہے مگر اس میں ہمیشہ ذم کا پہلو ہوتا ہے ۔

مولف نے منجملہ اور بحثوں کے غیر مستعمل الفاظ کی طرف بھی توجہ فرمائی ہے جو کتابی خزانوں میں بند اور بے کار پڑے ہیں اور جن سے ہم ناواقفیت یا کم فہمی کی وجہ سے کام نہیں لیتے ہیں ۔ ہمیں اس خیال سے بالکل اتفاق ہے ۔ درحقیقت ایسے الفاظ اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کا استعمال اب نہیں رہا یا جو ٹکسالی نہیں سمجھے جاتے ۔ حالانکہ وہ بعض خیالات کے ادا کرنے میں بہت کام آ سکتے ہیں ۔ افسوس ہے کہ قابل مولف نے اس بحث کو مختصر طور پر چند سطروں میں بیان کر دیا ہے ۔ یہ چنداں قابل شکایت نہیں کیونکہ اس مختصر کتاب میں ہر بحث تفصیل سے بیان نہیں ہو سکتی تھی لیکن شکایت اس کی ہے کہ انہوں نے مثال کے طور پر ایک لفظ بھی تو ایسا نہیں لکھا کہ ان کی رائے میں رواج دینے کے قابل ہے اگر وہ چند مثالیں بھی لکھ دیتے تو ناظرین کو مولف کے مطلب کے سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی ۔[1]

۱ ۔ تنقیدات عبدالحق ، مرتبہ محمد تراب علی خاں ، باز ، مطبوعہ شمس الاسلام پریس ، چھتہ بازار حیدرآباد دکن (بار اول) ، ۱۹۳۴ع ، ۱۱ - ۱۵ ۔

اس طویل ''تنقید'' کے بعد بابائے اردو مرحوم نے یہ تسلیم کیا ہے ''الفاظ کی تحقیق میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے اور اس سے کتاب کی قدر و قیمت کم نہیں ہو سکتی . . . . لائق مولف کی محنت قابل داد ہے ۔ یہ کتاب طلبہ اور عام شائقین کے لیے بہت کار آمد ہے ۔ اس سے ان کے دلوں میں الفاظ کی تحقیق ، لغوی ، معروف اور اصطلاحی معنوں کے فرق ، حالات زمانہ کے اثر سے معنوں میں تغیر و تبدل اور لفظوں کی اصل دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوگا اور یہ ادب کی تحصیل میں بہت کچھ مدد دیتا ہے ۔[1]

اقبال : مولوی احمد دین کی اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے طبع اور ضائع ہونے کی تفصیل پیش کی جا چکی ہے ۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا اور اس وقت وہی پیش نظر ہے ۔

اس کتاب کا پورا نام یوں ہے ''اقبال۔علامہ سر محمد اقبال کی اردو منظومات ان کے مقصد شاعری اور خیالات کے نشو و نما ، مضامین کلام اور طرز بیان پر ایک نظر ۔'' یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے جو بالترتیب ''کلام اقبال'' (صفحات ۱—۱۴۰) ۔ ''مضامین کلام'' (صفحات ۱۴۱—۲۱۵) اور ''طرز بیان'' (صفحات ۲۱۶—۲۸۴) کے عنوانات کے تحت ہیں ۔

پہلے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اقبال کی ذہنی نشو و نما کن حالات میں ہوئی اور اس کی شاعری ان حالات کی آئینہ دار کس طرح ہے اور کیوں ہے ؟ اس میں اقبال کی شاعری کے وہی تین دور لیے گئے ہیں جو ''بانگ درا'' میں ملتے ہیں اور پھر ہر دور کی خاص خاص نظموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے ۔ کتاب کا آغاز ڈرامائی انداز سے ہوتا ہے ۔ مصنف نے بازار حکیماں لاہور کی ادبی محفلوں کی منظر کشی کرتے ہوئے اقبال کا تعارف کرایا ہے اور پھر اقبال کی شاعری کے دور اول کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے اقبال کی تین نظموں ''نالۂ یتیم'' ، ''ایک یتیم کا خطاب ہلال عید سے'' اور ''ابر گہر بار یا فریاد امت'' کی تفصیل پیش کی ہے ۔ یہ نظمیں ''بانگ درا'' میں شامل نہیں ہیں ۔ ان کے بارے میں احمد دین لکھتے ہیں :

''یہ تینوں نظمیں ''بانگ درا'' میں جو علامہ اقبال نے شائع کی ہے موجود نہیں ۔ غالباً بعض اصلاحی وجوہات شاعری اور نظر ثانی کے لیے کم فرصتی کی بنا پر مجموعہ میں انہیں درج نہیں کیا گیا ۔ ان میں خیال کی وہ بلندی اور بندشوں کی وہ مسلسل لطافت اور چستی بھی نہیں جو بعد کی نظموں میں پائی جاتی ہے ، لیکن اس میں کلام نہیں کہ تاریخی اعتبار سے مجموعۂ کلام اقبال میں یہ نظمیں ایک

۱- تنقیدات عبدالحق - ۱۵ -

خاص اہمیت رکھتی ہیں جو نظر انداز نہیں کی جا سکتی ۔ اقبال کے اس سلسلہ منظومات میں جو اقبال کی شہرت کا باعث ہوئیں ، منظومات جو انہیں حمایت اسلام کے سالانہ اجلاسوں کے لیے لکھی گئیں اور پڑھی گئیں ، یہ تینوں نظمیں ایسی کڑیاں ہیں جو چھوڑی نہیں جا سکتیں ۔ علاوہ ازیں ان نظموں میں شاعری کا میلان طبیعت بھی ، اگرچہ سیدھے سادھے الفاظ اور بندشیں ہیں ، نمایاں ہے رسول عربی کا عشق اور قومی درد ایک ایک شعر میں ساری ہے ۔''[۱]

اس کے بعد اقبال کے مختصر حالات زندگی دیے گئے ہیں جن میں تحصیل علم اور پروفیسر آرنلڈ سے ملاقات کا ذکر ہے ۔ اس تعلیم و تربیت کا کیا اثر ہوا ؟ اس سلسلے میں مصنف رقم طراز ہیں :

''خاندان ، مدرسہ اور کالج کی تعلیم و تربیت کا اثر جیسا کہ واقعات مابعد نے ظاہر کیا ، اقبال کے دل میں مذہبی جذبات کا پیدا کرنا اور ابھارنا تھا ۔ جذبات جو اس کے کلام میں مختلف صورتوں میں جلوہ آرا ہوتے رہے ، حسن و عشق ، تصوف کے اصل اصول ہیں ۔ صوفیانہ مذاق کی آب یاری نے حسن و عشق کی ''کشت زار'' میں خوب گل کھلائے اور فلسفہ جو اقبال نے لاہور گورنمنٹ کالج کی عالیشان درسگاہ میں پڑھا تھا مذہب کے سایہ میں گوناں گوں رنگ لایا ۔''[۲]

رسالہ ''مخزن'' لاہور اور شیخ عبدالقادر کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کی ان نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے جو اس رسالے میں شائع ہوئیں ۔ اس سلسلے میں تیرہ نظموں ''ہمالہ'' ۔ خفتگان خاک سے استفسار اور ''پروانہ اور مچھ'' وغیرہ) پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے ۔ ہر نظم کے مختصر تعارف کے بعد وہ اشعار درج کیے ہیں جو ان نظموں کے مرکزی خیالات کے حامل ہیں ۔ ان نظموں کے متعلق احمد دین کا مجموعی تاثر یہ ہے :

''اس گلشن ہستی کے نظارے شاعر کی چشم بینا کے لیے حقائق کا ایک دبستان کھولے ہوئے ہیں اور ان نظر فریب نظاروں میں فلسفی تجسس کی نگاہ حقیقت کے راز اور تصوف کے اسرار دیکھتی ہے اور جادو کی زبان سے بیان کرتی ہے ۔''[۳]

اس کے بعد اقبال کی ان پانچ نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے جو بچوں کے لیے ہیں ۔ ''پرندے کی فریاد'' کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے :

''اس کی خوبی اور لطافت بیان نہیں ہو سکتی ۔ اس میں سوز و گداز دل ہلا دینے والا ہے اور اس کی میٹھی میٹھی درد ناک اور درد انگیز سریں بے تاب کیے

۱۔ اقبال ، از احمد دین مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس ، لاہور ، ۱۹۲۶ع ، ۸ ۔
۲۔ ایضاً ، ۱۱ ۔ ۳۔ ایضاً ، ۱۲ ۔

دیتی ہیں ۔ یہ نظم کیا بلحاظ سلاست زبان اور کیا بلحاظ سوز بیان اقبال کی بہترین منظومات میں سے ہے ۔ اس میں ایک خاص اہمیت بھی ہے ۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں کچھ سیاسیات کی جھلک سی ہے ۔ جھلک جو اب سیاسیات کی طرف اقبال کے رجحان خیالات کا پیش خیمہ ہے ۔''[۱]

یہاں تک اقبال کے جس کلام کا ذکر آیا ہے ، وہ ان کے گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہونے سے پہلے کی تخلیق ہے ۔ جب اقبال زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہوئے اس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا ۔ طالب علمی کے ماحول سے نکل کر انہیں نئے مشاہدات اور تجربات سے دوچار ہونا پڑا اور اس وجہ سے بقول احمد دین ان کے دل میں عشق رسولؐ پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا ۔ نیز انہیں ''حالات حاضرہ کی روشنی میں ملک و ملت کی سیاسی پستی کے ڈراؤنے گڑھے دل ہلا دینے والے نظر آئے ۔ ان حالات میں اقبال محبت بھرا دل رکھتے ہوئے سیاسیات سے دیر تک الگ نہیں رہ سکتے تھے ۔''[۲] اس کے بعد ان نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں سیاسی مسائل کی طرف اشارے تھے ۔ اس ضمن میں اقبال کے دور اول کی ان نظموں کی تفصیل پیش کی گئی ہے جن میں قومی و ملی جذبات کارفرما ہیں اور ہندوستان کے باہمی اتحاد کے خواب دیکھے گئے ہیں ۔ احمد دین نے نظموں کی تفصیل پیش کرتے ہوئے تشریح و تفسیر کا انداز اختیار کیا ہے ۔ ''تصویر درد'' کو خاص طور پر سراہا ہے اور اس کے بارے میں یہ رائے قائم کی ہے :

''یہ نظم محض ملکی نقطہ نگاہ سے لکھی گئی تھی ۔ اس میں امتیاز ملت و آئین کو معیوب و مطعون ٹھہرایا ہے ۔ وطن اور وطن پرستی اس کے موضوع اور فرقہ آرائی کو اس میں مذموم قرار دیا گیا ہے ۔ خیالات کی بلند پروازی اور کلام کی فسوں کاری کے لحاظ سے یہ نظم وطن پرست ادبیات ہند میں لاجواب ہے ۔''[۳]

اقبال کی دور اول کی شاعری میں فاضل نقاد کو عشق و عاشقی کے ساتھ ساتھ تصوف و حکمت کے عناصر بھی نظر آتے ہیں :

''. . . . لیکن شاعر کے اپنے جذبات میں ابھی وہ کشش نہیں ، اس کے اپنے دل میں ابھی وہ کیفیت وجدان نہیں جو اسے بزم قدرت کا رازدار کر دے ، جو اسے اسرار ہستی کا محرم بنالے ، اس کی آنکھ ابھی پابند مجاز ہے ، اس کا دل ابھی گرم نیاز ۔''[۴]

۱۔ اقبال ، ۱۹ ۔ ۲۔ ایضاً ، ۲۱ ۔
۳۔ ایضاً ، ۳۰ ۔ ۴۔ ایضاً ، ۳۵ ۔

نقاد کو اقبال کے ہاں اس دور کی شاعری میں خیالات کی بلند پروازی اور نزاکت بیان کی ''دلربائی'' بھی نظر نہیں آتی نیز وہ لطافت اور شوکت بھی محسوس نہیں ہوتی ''. . . . جو ولایت سے واپسی کے بعد اقبال کی شیوا بیانیاں ، گوناں گوں ترکیبوں میں دکھا رہی ہیں ۔'' ص ۳۷ ۔ اس دور کی شاعری میں نقاد کو دو باتیں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہیں : ایک تو ''وطن کے بت کی پوجا کا پرچار اور دوسری نظموں میں کسی خاص تعلیم ، خاص تلقین کی عدم موجودگی'' ۔ اس خیال کی توضیح وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :

''اس میں کلام نہیں کہ اس دور میں بھی مسلمانوں کے عادات و اخلاق اہل ہند کے مختلف مذاہب کی باہمی ناروا داری پر مواعظ ہیں جو سونے کے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہیں ، لیکن شاعر کے دل میں ابھی تک وہ جذبہ پیدا نہیں ہوا اور وہ کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی جو بعد میں اسے عجمیت سے متنفر اور حجازیت کا والہ و شیدائی بنائے ہوئے ہے ۔ ابھی تک اس کے سامنے کوئی خاص منتہائے مقصد نہیں ۔ اسے کسی خاص امر سے شغف نہیں ۔ ابھی تک اس کا دل ان تاثرات سے خالی ہے جو چند سال بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر آپ اپنا جہان پیدا کر لیتے ہیں ۔''[۱]

ستمبر ۱۹۰۵ع میں اقبال یورپ کے سفر کا عزم کرتے ہیں ۔ یہیں سے ان کی زندگی میں ایک نیا موڑ آتا ہے ۔ وطن پرستی ، ملت پرستی میں بدل جاتی ہے اور یہی کیفیت اقبال کی شاعری کے دوسرے دور کا عنوان ہے ۔ دوسرے دور کی نظموں کا جائزہ لینے کے بعد مولوی احمد دین اس نتیجے پر پہنچتے ہیں :

''دوسرے دور کی نظمیں فرنگستان کی آب و ہوا کی زائیدہ اور پروردہ ہیں ۔ ان میں لطافت اور نزاکت ، دل فریبی کے انداز میں جلوہ گر ہے ۔ خیالات کی پرواز عرش تک کی خبریں لا رہی ہے اور تخیل کی سبک سیری ابتدائے آفرینش کی باتیں بتا رہی ہے ۔ شاعر اب بزم قدرت کا راز دار ہو چلا ہے ، اب اسے عالم بالا کے کیمیا گر کی حرکات و سکنات سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع مل گیا ہے اور محبت کا نسخہ اور اس کی تاثیر اس سے مخفی نہیں رہی ۔ اب اسے حسن اور خدائے 'لم یزل' کی گفتگو سننے کا فخر حاصل ہے ۔ صرف یہی نہیں ، اس گفتگو کے چرچے بھی محفل قدرت میں اس نے دیکھے اور سنے ہیں ۔ مظاہر قدرت جو پہلے ہمارے فلسفی شاعر کے استفسارات پر کم توجہ کرتے تھے اب خود اسے حال دل سناتے ہیں اور اس کی ہمدردی کے متمنی نظر آتے ہیں ۔''[۲]

تیسرے مرحلے میں اقبال کی شاعری فکر و نظر کی مزید منزلیں طے کرتی ہے

۱۔ اقبال ، ۳۸ ۔ ۲۔ ایضاً ، ۶۱ ۔

یا اس میں کچھ اور وسعت پیدا ہوتی ہے ، کچھ اور نئے خیالات راہ پاتے ہیں ۔ اس دور کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی صاحب لکھتے ہیں :

''ان نظموں میں بتایا گیا ہے کہ مادہ پرستی سے سچی خوشی اور نسل انسان کی حقیقی ترقی ممکن نہیں اور تجربہ سے یہ امر پایۂ ثبوت کو بھی پہنچ چکا ہے کہ بنی آدم کی مسرت اور اس کے ارتقا کا راز روحانی زندگی میں ہی مضمر ہے ۔ دنیا کو ظلمت اور تباہی سے بچانے کے لیے نور توحید سے اقصائے عالم کو منور کرنا ضروری ہے اور اس لیے اسلامیوں کو جو امانت توحید کے حامل ہیں لازم ہے کہ اپنے فرض کی ادائیگی میں نور توحید پھیلانے کے لیے کمربستہ ہو جائیں اور مساوات و اخوت کا سبق جو ان کے پیارے نبی نے انھیں دیا تھا اس پر عمل پیرا ہوں اور قول سے فعل سے اس سبق کی تعلیم عام کریں ۔''[۱]

اس سلسلے میں ''ترانہ ملی'' ، ''شکوہ'' ، ''شمع و شاعر'' ، ''جواب شکوہ'' ، ''خضر راہ'' اور ''طلوع اسلام'' پر طویل تبصرے کیے ہیں ۔ ان چھ نظموں کا تذکرہ تقریباً چوالیس صفحات میں پھیلا ہوا ہے ۔ مولوی صاحب نے تفصیل سے ان نظموں کو پرکھا ہے اور ان خصوصیات کو اجاگر کیا ہے جن کی بنا پر یہ نظمیں کلام اقبال ہی میں نہیں ، اردو شاعری میں بھی امتیازی حیثیت رکھتی ہیں ۔ اس دور کی شاعری پر مولوی احمد دین صاحب کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے :

''اقبال کے اردو کلام کا بہترین حصہ اسی دور کا لکھا ہوا ہے ۔ اس دور میں شاعر حقیقت کا ترجمان ہے اور قدرت کا راز دار ۔ مظاہر قدرت اس کے ساتھ باتیں کرتے ہیں ، وہ ان سے اسرار زندگی سیکھتا ہے اور بسا اوقات انھیں اصول حیات کی تعلیم بھی دیتا ہے اور کمال زندگی حاصل کرنے کے گر بھی بتاتا ہے ۔''[۲]

تینوں ادوار کی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے مولوی احمد دین نے بڑی پتے کی بات کہی ہے ۔

''یہ دور شروع سے آخر تک تعمیری کام میں منہمک ہے ۔ شاعر نے دور اول میں ذوق استفہام کی بدولت قدرت سے اصول زندگی اخذ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے بار بار تقاضوں پر دور دوم میں قدرت نے اپنے اسرار زندگی کے راز اسے بتائے ہیں اور اب قدرت کے اسرار ، اس کے راز ، اس کے آئین سے واقف ہو کر شاعر نے قوم کے لیے ملت کے قیام و دوام کی غرض سے لائحہ عمل تیار کرنے کی کوشش کی ہے ۔''[۳]

۱- اقبال ، ۷۸ ۔ ۲- ایضاً ، ۱۳۳ ۔
۳- ایضاً ، ۱۳۰ ۔

اس کتاب کا دوسرا باب ''مضامین کلام'' ہے ۔ اس میں اقبال کی شاعری کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اقبال نے کن کن مسائل کو توجہ کا مرکز بنایا ۔ یہ حصہ چودہ ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے ۔ آغاز میں مصنف نے محمد حسین آزاد کا اقتباس (از آب حیات) دیا ہے جس میں یہ توقع کی گئی ہے کہ اردو نظم پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ عاشقانہ مضامین کے سوا کسی اور مضمون کے ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ، اس کو ہمارے نوجوان دور کریں گے ۔ ایسے نوجوان جو مشرقی و مغربی علوم پر قابض ہوں ۔ احمد دین آزاد کے اس خواب کی تعبیر اقبال میں دیکھتے ہیں ۔ انہوں نے اس سلسلے میں حالی ، اکبر اور اقبال کے نظریات پر بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ حالی اور اکبر میں مشرق و مغرب کا ملاپ نظر نہیں آتا ۔ اقبال ، آزاد کی خواہشات کے عین مطابق ہیں کیونکہ ''انھوں نے علوم مشرقی و مغربی میں دسترس پیدا کی . . . زمین شعر میں مشرق و مغرب کے سنگم سے وہ آبیاریاں کیں کہ چپہ چپہ پر گل و گلزار کے تختے نظر آنے لگے . . . . اقبال نے ہوس پرستی کی مضمون بندیوں سے آزاد ہو کر رفعت مقاصد اور عالی ہمتی کی فضاؤں میں بلند پروازیاں کیں اور قومی و مذہبی ، اخلاقی ، فلسفی ، صوفیانہ اور سیاسی مضامین پر اپنی سحر طرازیوں سے بے بہا موتی پرو کر اردو کے خزانے بھر دیے ۔''[1]

اقبال کے موضوعات سخن کے سلسلے میں احمد دین نے سب سے پہلے یہ بتایا ہے ''کہ کلام اقبال'' میں جس امر کی طرف سب سے زیادہ اشارے ملتے ہیں وہ یہ ہے کہ ساری دنیا ''نور توحید'' کی والہ و شیدا ہو جائے :

''اقبال چہانے عالم میں توحید کے نعرے سننا چاہتا ہے اور ساری خدائی کو خدائے واحد کا پرستار دیکھنے کا خواہاں ہے ۔ وہ مذہب کی پاکیزگی میں اور اس کے نزدیک مذہب میں وحدانیت کے بغیر پاکیزگی ممکن نہیں ، انسان زندگی کے مدارج اعلیٰ پاتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ انسانی ترقی ، اس کی حقیقی ترقی کا (کی) معراج یہی ہے ، یہی پاکیزگی ہے ۔ مادی ساز و سامان چاہے کتنی ہی حیرت اور استعجاب کی نمائشیں کرے ، سطوت و شوکت کے مظاہرے دکھائے ، اس سے حقیقی ترقی میسر نہیں بلکہ اس میں نسل انسان کی تباہی اور ویرانی مضمر ہے ۔ انسان زمین پر اللہ کے نائب کی حیثیت میں ہے اور اس کے فرض منصبی کی ادائیگی میں مادیت کی جھنکار ، گرج اور گونج کا کوئی حصہ نہیں ، کچھ واسطہ نہیں ، یہاں دل کی تطہیر اور روح کی پاکیزگی درکار ہے ۔''[2]

١- اقبال ، ١٤٨ ۔ ٢- ایضاً ۔

دوسری اہم بات جو انھیں اقبال میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اقبال مستقبل کا شاعر ہے ۔ وہ حالی کی طرح ماضی کی داستاں تازہ کر کے رلاتا نہیں اور نہ اکبر کی طرح محض تہذیب حاضر کا مذاق اڑانے پر اکتفا کرتا ہے ''بلکہ وہ مستقبل اور ایک شان دار مستقبل ، عقیدت کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور اپنے مدہوش اور گم کردہ راہ بھائیوں کو اس مستقل کے جلوے دکھا کر اور تہذیب نو کی نظر فریبیوں سے ہٹا کر اسلام کی شاہ راہ پر لے چلنے پر مصر ہے ۔''[1] موجودہ دور کے ایک ممتاز نقاد نے حالی ، اکبر اور اقبال کے بارے میں یہی بات دوسرے الفاظ میں کہی تھی جسے بڑی شہرت حاصل ہوئی تھی ، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ احمد دین ہی وہ نقاد ہے جس نے سب سے پہلے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ۔ ان تینوں شاعروں نے ہماری قومی زندگی میں جو کردار ادا کیا ہے اس کی صراحت احمد دین سے بہتر کسی نے نہیں کی یعنی یہ کہ حالی ، اکبر اور اقبال بالترتیب ماضی ، حال اور مستقبل کے شاعر ہیں ۔ احمد دین کو اقبال میں ایک خصوصیت یہ بھی نظر آتی ہے کہ اس کی حاسۂ باطنی حالات اور واقعات ظاہری کو دل کی آنکھوں سے دیکھتی ہے ۔ اس کا مشاہدہ حقیقت کو بے نقاب پاتا ہے اور اس کا کلام راز حقیقت کے انکشافات سے لبریز ہے[2] اور اس طرح وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال صحیح معنوں میں تلمیذ الرحمٰن ہے کیونکہ اس کی بہت سی باتوں کو جو آئندہ زمانے سے متعلق تھیں ، وقت نے صحیح ثابت کر دکھایا اور اس طرح ''اقبال آنے والے دور کا شاعر ہے ۔ اس کی آنکھوں پر اسرار حیات آشکار ہیں اور راز حقیقت عیاں ۔''[3]

احمد دین نے اقبال کے فلسفۂ خودی پر بھی ایک نظر ڈالی ہے اور ''خودی ، خودداری اور خود افزائی'' کا عنوان قائم کر کے کسی حد تک فلسفۂ خودی کی افہام و تفہیم کی کوشش کی ہے ۔ اگرچہ اقبال کے فارسی کلام کو نظر انداز کر کے صرف اردو کلام کی مدد سے اقبال کے نظریۂ خودی کی وضاحت ممکن نہیں ، لیکن احمد دین نے اردو نظموں کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ بڑی حد تک اقبال کے نظریے کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے ۔

کلام اقبال کی سب سے اہم خصوصیت ''پیغام عمل'' ہے ۔ احمد دین نے بتایا ہے کہ یہی پیغام کلام اقبال کی اصل روح ہے اور اس کی گونج شروع سے آخر تک سنائی دیتی ہے ۔ مختصر یہ کہ اقبال کے مذہب میں عمل زندگی کا اصل اصول ہے اور اس کے نزدیک ہماری روحانی ترقی اور تنزل بھی عمل سے ہی وابستہ ہے ۔ بہشت

۱- اقبال ، ۱۵۳ ۔ ۲- ایضاً ، ۱۵۷ ۔
۳- ایضاً ، ۱۶۰ ۔

کی نعمتیں ، دوزخ کا عذاب اسی عمل کا نتیجہ ہے ۔[۱]

کلام اقبال میں مذہب کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ظاہر ہے ۔ مسلمانوں کی ''زبون حالی'' پر جتنے آنسوں انھوں نے بہائے ہیں اور ان کے خوش گوار مستقبل کے خواب جس قدر انھوں نے دیکھے ہیں وہ فکر اقبال کی ابتدا بھی ہیں اور انتہا بھی ۔ احمد دین نے ''مذہب'' کا عنوان قائم کر کے ان آنسوؤں اور خوابوں کی نہایت دل کش تصویر پیش کی ہے اور مذہب کے سلسلے میں یہ امر بھی واضح کر دیا ہے کہ اقبال دوسرے مذہبوں کے پیروؤں کی دل آزاری نہیں کرتے ۔

اقبال کے نظام اخلاق پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ان کے سیاسی نظریات کو بھی تفصیل سے پیش کر کے یہ بتایا ہے کہ اقبال کے نزدیک مغرب کا جمہوری نظام قیصریت ہی کا دوسرا روپ ہے ۔

''اقبال آزادی۔انفرادی اور قومی کا حامی ہے لیکن . . . وہ آزادی کے لیے آئین کی پابندی لازمی سمجھتا ہے ۔ اس کے ذہن میں حریت کی بنیاد اطاعت پر ہے جو آزادی ربط و ضبط سے نفور ہے آزدی نہیں ۔ طغیان ہے اور اس کا انجام معلوم ۔''[۲]

تہذیب نو کی خامیوں کی طرف اقبال نے جو اشارے کیے ہیں ، انھیں بھی احمد دین نے پوری طرح واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ اقبال تہذیب نو کی کم عیاری سے پوری طرح واقف ہے اور اپنے ہم مشربوں کو وہ اس تہذیب کے زہر سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے ۔

احمد دین نے اقبال کے متصوفانہ خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اقبال نے تصوف کی گود میں پرورش پائی تھی اس لیے تصوف سے اس کا دلچسپی لینا فطری رجحان ہے ، لیکن وہ اس تصوف کا قائل نہیں جو انسان کو خود فراموش بنا دے بلکہ اس تصوف کی تلقین کرتا ہے جو عین خودی ہے ۔ تصوف اور فلسفہ و حکمت کا جو گہرا تعلق ہے ، اس کی بنا پر احمد دین نے اقبال کے ان فلسفیانہ خیالات کا جائزہ بھی لیا ہے جو حیات و کائنات کے گوناں گوں مسائل سے متعلق ہیں ۔ زندگی اور موت کے مسئلے پر بھی اقبال کے خیالات کی وضاحت کی ہے ۔ یہ ساری بحث تقریباً بائیس تئیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور آج بھی اقبال کے خیالاب کو سمجھنے میں بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے ۔

آخر میں ''وطنیت'' ، ''عجمیت'' اور ''پان اسلام ازم'' کے بارے میں اقبال کے خیالات کی تشریح علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت کی گئی ہے ۔ ان بحثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اقبال ''وطن'' کے بت کو ملی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ

۱- اقبال ، ۱۷۰ - ۲- ایضاً ، ۱۷۸ - ۱۷۹ -

سمجھتے ہیں ۔ اس طرح وہ عجمیت سے اپنی بےزاری کا اعلان کرتے ہیں اور ''حجازی تہذیب'' کی پرانی شراب کے پیاسے نظر آتے ہیں ۔ اقبال کے نظریۂ پین اسلام ازم کے بارے میں احمد دین کی رائے یہ ہے :

''کہا گیا ہے کہ اقبال ، اتحاد سیاسیہ ملیہ کا علمبردار ہے ۔ وہ مسلمانانِ عالم کی تنظیم سے ان کا سیاسی اقتدار تختۂ دنیا پر قائم کرنا چاہتا ہے ۔ اقبال کا کلام اگر بغور پڑھا جائے ، ہمیں بتا دے گا کہ اسلامیوں کا سیاسی تسلط اس کی شاعری کا مقصد ہرگز نہیں ۔ اس کا مدعا ، اس کی نغمہ سرائیوں کا موضوع سیاسیات کی چالبازیوں سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے ۔ وہ سیاسیات میں ، اقتصادیات میں ، دنیا کی مادی ترقی میں ، نئی تہذیب کے آرام و آسائش میں ، اس کی شوکت و سطوت میں ، اس کے تجمل و شان میں ، ارتقائے انسانی نہیں دیکھتا ۔ وہ تو عالم موجودات میں حضرت انسان کی عظمت و وقار کے جلوے ، عظمت و وقار جو خلافت الٰہی کے شایانِ شان ہے ، دیکھنے کا خواہاں اور متمنی ہے ۔''[1]

کتاب کا آخری حصہ ''طرزِ بیان'' ہے جو انیس ذیلی عنوانات میں تقسیم ہے ۔ سب سے پہلے فاضل نقاد نے یہ بتایا ہے کہ اقبال اگرچہ روایتی عشق و محبت اور بوالہوسی سے اپنے پیشروؤں ، حالی اور اکبر کی طرح ، سخت متنفر ہیں لیکن انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے عشق و محبت کی قدیم اصطلاحات اور رموز و علائم سے پورا پورا استفادہ کیا ہے ۔ قدیم شاعروں کی طرح ان کے ہاں بھی گل و گلزار ، رنگ و بُو ، ساقی و مینا اور رقص و سرود کی علامتیں موجود ہیں لیکن اقبال نے ان علامتوں کو ایک نئی معنویت دی ہے ۔ اقبال قدیم شاعروں کی رنگین بیانی کا شیدائی ہے اور اس رنگین بیانی کے ذریعے وہ ان خیالات کو پیش کرتا ہے جن کا قدیم شاعروں سے کوئی تعلق نہیں ۔ اس سارے معاملے کی وضاحت یوں کی گئی ہے :

''بوالہوس قوم سو سال سے ہوس بازی میں مشغول اور کئی سو سال سے عیش پرستی اور غفلت و سکون کی زندگی کی مفتوں ہو رہی تھی ۔ مذاق بگڑے ہوئے تھے ۔ قوم کے مایہ ناز چشم فتاں کے مجروح ، خم ابرو کے شہید ، بے کار ، نادار ، مئے پندار سے سرشار ، غفلت کی شراب سے مخمور ، دنیا و مافیہا سے بےخبر اور زمانہ کی چال سے نا آشنا بے اعتنائی کے سرور میں پڑے تھے اور ان حالات میں شنوائی اور کام کی بات کی شنوائی مشکل نظر آتی تھی ۔ فلسفی دماغ نے سامعین کے مذاق کو ملحوظ رکھنے میں حکم تاثیر دیکھا ۔ قوم کو اس خواب غفلت سے جگانا ضروری تھا ان کی ان سرمستیوں سے انہیں ہوش میں لانا لازمی تھا ۔ تقاضائے وقت سے وہی پرانی مجلسیں گرما دیں ۔ وہی راگ ، وہی رنگ ، وہی ساقی ، وہی مینا ،

۱- اقبال ، ۲۱۱ ۔

وہی شکوے اور وہی شکایتیں ہونے لگیں ۔ سونے والے جو پہلے ہی سے حالی کے نالوں اور اکبر کی چٹکیوں سے کچھ کچھ جاگ رہے تھے اپنے پرانے مذاق کے موافق حسن و عشق کی سریں سن کر الھ بیٹھے ہیں اور شاعر یقین کرتا ہے کہ یہ لوگ زبان کی چاشنی سے لذت پا کر نئے مذاق کی حقیقت سے آپ ہی آشنا ہو جائیں گے ، میدان سعی میں نکل آئیں گے ، اسلام کی روایات کو سامنے رکھ کر خلوص کے راستے پر قدم بڑھائیں گے اور محبت و اخوت کے نقش پھنائے عالم میں جما دیں گے ۔ اقبال اعلیٰ قومی جذبات بیان کر رہا ہوتا ہے اور وہی ہوس بازی کی اصطلاحیں ، وہی حسن و عشق کی زبان ، وہی استعارے ، وہی تشبیہیں ، وہی رنگ ، وہی راگ ، وہی سریں استعمال کرتا ہے ۔''[۱]

اقبال کی ''خیال بندی'' کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی چند نظموں ''نیا شوالہ'' ''شمع و شاعر'' اور ''شکوہ و جواب شکوہ'' کا حوالہ دیا گیا ہے ۔ دو مختصر نظمیں ''ایک پرندہ اور جگنو'' اور ''حقیقت حسن'' درج کر کے اقبال کی بلند خیالی کی مثالیں پیش کی گئی ہیں ۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب کا انداز تنقید سراسر تاثراتی ہے ۔ انھوں نے ''بلند خیالی'' کا تجزیہ کچھ زیادہ گہرائی سے نہیں کیا ۔ اقبال کی مشکل پسندی کو انھوں نے غالب کا اثر بتایا ہے ۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے ، وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے ۔ شیخ عبدالقادر نے ''مخزن'' میں اس موضوع پر جو لکھا تھا ، اسے درج کرنے کے بعد احمد دین لکھتے ہیں :

''اہل بینش بخوبی سمجھتے ہیں کہ اقبال کا خطاب عوام کو نہیں وہ صرف انھی لوگوں کو مخاطب کر رہا ہے جو اہم امور ملیہ کے سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں ۔ وہ جذبات عامہ کو نہیں بھڑکاتا ۔ شورش اس کا مقصد نہیں ۔ فوری انقلاب میں وہ فلاح قومی نہیں دیکھتا ۔ وہ نمو کا قائل ہے ۔ وہ دماغ کی اعلیٰ ترین تحریکوں سے دل کے افضل ترین ولولے ابھارتا ہے ۔ دل اور دماغ کی اشتراکی قوت عمل سے کمال انسانیت کے جلوے دکھانا چاہتا ہے ۔ اس کے خیالات عالم روحانیت کے پرتو ہیں اور عوام ان کے فہم و ادراک سے قاصر ہیں اور اس کی زبان بھی خیالات کے مطابق دقیق ہوتی ہے اور ہر ایک آدمی کو اس سے حظ اٹھانا میسر نہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اقبال کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اسلوب بیان کے لیے موقع اور محل ملحوظ رکھتا ہے ۔ اگر مضمون دقت طلب ، اہم ہے اور رہنمایان قوم ہی مخاطب ہیں تو اس کی زبان مشکل اور دقیق نظر آئے گی ۔ اگر وہ عوام کو کوئی بات سمجھانا چاہتا ہے تو اس وقت اس کا کلام عام فہم ہوتا ہے ۔''[۲]

۱۔ اقبال ، ۲۱۷ ۔
۲۔ ایضاً ، ۲۲۶ - ۲۲۷ ۔

احمد دین نے اقبال کی مشکل گوئی اور سادہ بیانی کے سلسلے میں بتایا ہے کہ ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' اس لیے آسان زبان میں ہیں کہ ان کا تعلق عام مسلمانوں کے جذبات سے ہے ۔ ''شمع و شاعر'' کا تعلق عام مسلمانوں سے نہیں ، ان مسلمانوں سے ہے جو قوم کی رہنمائی کرتے ہیں ۔ اس لیے اس کا اسلوب بدلا ہوا ہے ۔ اس کے بعد کلام اقبال میں ''شوکت بیان'' ، ''سوز و گداز'' ، ''تشبیہات و استعارات'' ، ''جوش'' ، ''طرفگی بیان'' اور ''موسیقیت'' کے عناصر کی نشان دہی کی گئی ہے ۔ ''امید'' کا عنوان قائم کر کے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اقبال کسی عالم میں مایوس نہیں ہوتے ۔ ان کے کلام میں ''نا امیدی کی سریں اور آہ و بکا کم یاب ہے اس کے نالے بھی نئے انداز کے ہوتے ہیں ۔ اسے شام غم بھی صبح امید کی خبر دیتی ہے اور ظلمت شب میں اسے امید کی کرن نظر آتی ہے ۔''[1]

طرز بیان کے سلسلے میں احمد دین نے سب سے اہم بحث اس موضوع پر کی ہے کہ اقبال مناظر قدرت اور مادی دنیا سے اخلاقیات ، معاشرت اور سیاسیات کے زرین اصول اخذ کرتا ہے اور مسائل فلسفہ کے ایسے نکات کا استدلال کرتا ہے ، جن سے عقل حیران رہ جاتی ہے ، مضمون آفرینیاں دلفریب اور حیرت‌انگیز ہیں[2] ۔ اس موضوع پر احمد دین نے جو کچھ لکھا ہے ، وہ ان کی نقادانہ بصیرت کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے ۔ کلام اقبال کے اس پہلو پر آج تک کسی نقاد نے اس انداز سے روشنی نہیں ڈالی ۔ احمد دین نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اقبال جب بھی کسی قومی و ملکی مسئلے پر یا انسانی زندگی کے کسی پہلو پر اظہار رائے کرتے ہیں اور انسانی فطرت کی پیچ در پیچ گتھیوں کو سلجھاتے ہیں تو خود فطرت ہی ان کے لیے ایسی مثالیں مہیا کر دیتی ہے جن سے ان کے شاعرانہ مطالب کو سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا ہو جاتی ہے ۔ دریا ، قطرہ ، درخت کی سوکھی ٹہنی ، شبنم ، گوہر وغیرہ کے استعارے ، قومی اتحاد اور انسانی نفسیات کے بیان میں بڑی وضاحت پیدا کر دیتے ہیں ۔ اس طرح ''پھول'' کا استعارہ بھی ''چشم بینا اور گوش شنوا کے لیے اسباق کا ایک دفتر کھولے ہوئے ہے'' ۔ اقبال کو حیات انسانی کے مختلف مراحل میں جو کیفیات نظر آتی ہیں ان کے اظہار کے لیے بھی خصوصیات گل یعنی خود فروشی ، خود نمائی اور خود فراموشی وغیرہ کا سہارہ لیا جاتا ہے ۔ اسی طرح گل و گلزار کے تمام متعلقات شعر اقبال میں بہاراں کا سماں پیدا کر دیتے ہیں ۔ علو ہمتی کے بیان کے لیے بھی اقبال نے جو مثالیں دانہ ، خاک ، روئیدگی ، بالیدگی پیش کی ہیں وہ بھی آغوش فطرت ہی سے مستعار لی ہیں ۔ خودداری کے لیے بھی اقبال حباب ہی کی مثال پیش کرتے

۱۔ اقبال ، ۲۴۲ ۔ ۲۔ ایضاً ، ۲۴۴ ۔

ہیں جو دریا میں بھی اپنا پیمانہ نگوں رکھتا ہے ۔ اس طرح وہ موج اور دریا کی علامتوں سے قومی اتحاد کا پہلو نکالتے ہیں ۔ سادہ زندگی بسر کرنے اور ذوق عمل پیدا کرنے کے لیے بھی اقبال نے بحر و بیابان کی وسعتوں سے استفادہ کیا ہے ۔ مختصر یہ کہ اقبال نے اپنا سارا فلسفہ فطرت کے مظاہر کے ذریعے پیش کیا ہے ۔ صبح و شام ، دوپہر ، رات ، سورج ، چاند اور ستارے آسمان یہ سب اقبال کے محبوب استعارے ہیں اور ان مظاہر کی کیفیات اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں مماثلت اور مطابقت کی نشاندہی کر کے اقبال نے اپنے سلسلۂ سخن کو مؤثر و دلنشیں بنایا ہے ۔ احمد دین نے یہ بھی بتایا ہے کہ اقبال نے مظاہر فطرت کو محض ایک وسیلے کے طور پر استعمال نہیں کیا ، بلکہ ایک بلند پایہ مصور کی طرح ان کی تصویرکشی بھی کی ہے جس سے حسن فطرت اور بھی کچھ نکھر جاتا ہے ۔ اقبال کی واقعات نگاری اور جذبات نگاری کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے ۔ اس سلسلے میں ''غلام قادر روہیلہ'' ، ''آفرینش محبت'' اور ''عشق اور موت'' کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ اقبال کو جذبات نگاری میں زبردست کمال حاصل تھا ۔ آخر میں ''اردو اور اہل پنجاب'' کے عنوان سے خود اقبال اور مولانا اسلم جیراج پوری کے مضامین سے اقتباسات پیش کر کے اُن اعتراضات کے جواب میں ، جو اقبال کی زبان پر کیے گئے تھے ، اقبال کی پختگیٔ بیان کو واضح کیا گیا ہے ۔ آخر میں ''اقبال اور ابنائے وطن'' کے عنوان سے اقبال کی اس شکایت کو پیش کیا ہے کہ مضامین کلام سے ابنائے وطن بے التفاتی کرتے ہیں اور پیام مشرق کے وہ فارسی اشعار نقل کیے ہیں جن میں اقبال نے یہی شکوہ خود اپنی زبان میں کیا ہے ۔ اس طرح اقبال کے اردو کلام کے بارے میں یہ کتاب اقبال کے فارسی اشعار پر ختم ہو جاتی ہے ۔

احمد دین کی یہ کتاب ایک بہت بڑا تنقیدی کارنامہ ہے ۔ اردو تنقید کی تاریخ لکھنے والوں نے احمد دین کو کبھی قابل التفات نہیں سمجھا حالانکہ وہ ہر اعتبار سے اردو کے نقادوں میں ایک ممتاز جگہ پانے کے مستحق ہیں ۔ ان کی یہ تصنیف عملی تنقید کی ایک عمدہ مثال ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ احمد دین تنقید میں تشریحی و تاثراتی انداز اختیار کرتے ہیں لیکن وہ اقبال کو اس کے عہد اور ماحول سے الگ کر کے نہیں دیکھتے ۔ انھوں نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کا تجزیہ کرتے ہوئے ہر موقع پر اُن معاشرتی و سیاسی حالات کو بھی پیش نظر رکھا ہے جن میں اقبال کی ذہنی نشو و نما ہوئی تھی ۔

احمد دین نے یہ کتاب ایک ایسے زمانے میں لکھی جبکہ اردو تنقید کا سرمایہ ہی محدود تھا ۔ اس طرح انھوں نے اردو کی تنقیدی روایت کو آگے

بڑھانے میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے ۔ یہ کتاب اس نقطہ نظر سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اردو میں پہلی بار اس کتاب کے ذریعے کسی شاعر کی فنی خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے ۔ اس سے پہلے شعرا کے بارے میں مختلف مضامین تو نظر آ جاتے ہیں لیکن کوئی مستقل کتاب نہیں ملتی ۔ اقبال کے فن کا پہلا سیر حاصل جائزہ ہونے کی وجہ سے بھی اس کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے ۔ مولوی احمد دین پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اقبال کے کلام کا ایسا تفصیلی تجزیہ پیش کیا جس نے بعد کے لکھنے والوں کے لیے ایک رہنما کا فرض انجام دیا ۔ یہ دوسری بات ہے کہ استفادہ کرنے والوں نے اس کتاب کا حوالہ دینے کو اپنے شایان شان نہ سمجھا ۔

مولوی احمد دین اور اقبال کے تعلقات کے پیش نظر یہ ممکن تھا کہ مولوی صاحب بلا وجہ اپنے ممدوح کی مدح سرائی کرتے لیکن ان کی کتاب اس عیب سے پاک ہے ۔ انھوں نے کہیں ، کسی جگہ اقبال کی بے جا تعریف نہیں کی نیز اپنی عقیدت کو مبالغے کا لباس نہیں پہنایا ۔ انھوں نے جو بات بھی کہی ہے ، مدلل انداز سے کہی ہے اور اسی بنا پر یہ کتاب آج بھی اقبال فہمی کے لیے ایک مفید دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے ۔

ضمنی طور پر اس کتاب میں حیات اقبال کے بعض پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ خصوصاً اقبال کی ابتدائی ادبی زندگی کے بارے میں بڑی قیمتی معلومات ہیں ۔ لاہور کی ادبی محفلوں اور حمایت‌الاسلام کے جلسوں میں اقبال کی مقبولیت کے بارے میں مولوی صاحب نے عینی شاہد کی حیثیت سے جو کچھ لکھا ہے ، وہ ان کے سوانح نگار کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔

یہ کتاب جب شائع ہوئی تھی تو برصغیر ہند و پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں اس کا خاصا چرچا ہوا تھا ۔ اردو کے کئی ممتاز لکھنے والوں نے مختلف رسائل میں اس پر تبصرے کیے تھے ۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بھی رسالہ ''اردو'' بابت اکتوبر ۱۹۲۶ء میں ایک مفصل تبصرہ لکھا تھا ۔ انھوں نے دبے لفظوں میں اس کتاب پر اعتراض کیا تھا کہ ''یہ تنقید نہیں بلکہ اقبال کی شاعری کے محاسن ہیں'' ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولوی احمد دین نے کلام اقبال کی خامیوں سے بحث نہیں کی لیکن اس کتاب کو دائرۂ تنقید سے خارج کرنا اور اسے محض ''محاسن شماری'' بنانا بھی درست نہیں ۔ شاید یہاں بابائے اردو مرحوم نے لفظ ''تنقید'' کو نہایت محدود معنوں میں استعمال کیا ہے ورنہ ان جیسے بالغ نظر سے ایسی رائے کی امید نہیں ہو سکتی ۔

اسلوب بیان : مولوی احمد دین کی تصانیف سے بہت سے اقتباسات اس

مقالے میں دیے گئے ہیں جن سے مولوی صاحب کے اسلوب اور انداز تحریر کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ مولوی صاحب نے سوانح ، تنقید ، ادب ، تاریخ ، انشائیہ ، ناول اور لسانیات جیسے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے ۔ لیکن موضوعات کی اس بوقلمونی کے باوجود ان کے اسلوب میں کسی قسم کی ناہمواری پیدا نہیں ہوتی اور وہ اپنے استاد محمد حسین آزاد کی روش پر چلتے ہوئے ہر میدان میں اپنی انشا پردازی کا لوہا منواتے ہیں ۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں مولانا آزاد کے اسلوب کی کامیاب پیروی کی ہے اور بعض جگہ تو ان کی تحریروں پر آزاد ہی کی تحریر کا گمان ہوتا ہے ۔ مثلاً بازار حکیماں کی ادبی محفلوں سے متعلق جو اقتباس اوپر دیا گیا ہے وہ بالکل ''آب حیات'' کے رنگ کا ہے یا ''راز و نیاز'' کا محولہ بالا اقتباس ''نیرنگ خیال'' کے اسلوب کی غمازی کرتا ہے ۔ مولوی احمد دین نے آزاد کی محض نقالی نہیں کی بلکہ ان خصوصیات کو اپنانے کی کامیاب کوشش کی ہے جو آزاد کی نثر کا طرّۂ امتیاز ہیں ۔

احمد دین نے تاریخی تحریروں میں ''سادہ بیانی'' ہی سے کام لیا ہے لیکن ان کے اسلوب کی نمائندہ تصانیف ''اقبال'' اور ''سرگزشت الفاظ'' ہیں ، وہ زور بیان پیدا کرنے کے لیے مترادفات کا استعمال بڑے سلیقے سے کرتے ہیں اور کہیں کوئی لفظ غیر ضروری محسوس نہیں ہوتا ۔ جہاں انھیں کوئی اخلاقی یا قومی مسئلہ پیش کرنا ہوتا ہے وہاں وہ اپنا زور بیان خوب دکھاتے ہیں ۔ آزاد کی طرح مسائل کو تمثیلی انداز سے پیش کرنے میں بھی انھیں کمال حاصل ہے ۔ اس کی بہترین مثال ان کا انشائیہ ''راز و نیاز'' ہے جس کی تفصیل سطور بالا میں پیش کی جا چکی ہے ۔ بعض اوقات وہ علمی مباحث میں ایسا پیرایہ اختیار کرتے ہیں جس سے تحریر میں گفتگو کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے ۔ قاری کو بار بار مخاطب کر کے بھی وہ کتاب کی علمی فضا کو ''ذاتی رنگ'' دے دیتے ہیں ۔